رجسٹرڈ نمبر ۱ صفحہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

جلد (۹) عدد (۲)
شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ (۸ر)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت غیر مجلد (للعہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت سکہ انگریزی عہ سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۵ھ جلد ۹ عدد ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب رضوی کا ایک عنایت نامہ شائع کیا جارہا ہے جو حال میں مدیر رسالہ کے نام وصول ہوا تھا۔ صاحب موصوف کی اس تحریر کو دیکھنے کے بعد یہ مناسب سمجھا گیا کہ اشاعت سے پہلے ان سے نظر ثانی کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ انھیں لکھا گیا کہ جہاں تک مولٰنا شبیر احمد صاحب عثمانی کی ذات کا تعلق ہے، فتویٰ سے رجوع کرنے کے بعد یہ قضیہ ختم ہوچکا ہے۔ آپ مدیر رسالہ پر جس قدر چاہیں اعتراضات فرمائیں سخت سے سخت اعتراضات جو آپ کے امکان میں ہوں، آپ کرسکتے ہیں، اور اطمینان رکھیے کہ وہ اس رسالہ میں بے تامل شائع کیے جائیں گے کیونکہ اس رسالہ کا ایڈیٹر جس طرح دوسروں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا، اسی طرح خود اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھتا۔ البتہ مولٰنا کے طرز عمل کو اب دوبارہ معرض بحث میں لانا بالکل نامناسب ہے۔ اس حصہ کو خارج کرنے کے بعد اگر آپ کوئی اصولی بحث فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے، اس سے بہرحال کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔

لیکن صاحب موصوف نے ہماری اس درخواست کو شرف قبول نہ بخشا۔ اور اپنے اسی مطالبہ پر مصر رہے کہ اس تحریر کو بجنسہ شائع کیا جائے۔ ان کا مقصد جیسا کہ انہوں نے اپنے دوسرے عنایت نامہ میں ظاہر کیا ہے "علماء اسلام کی پوزیشن صاف کرنا اور اُس غلط فہمی کو دور کرنا ہے۔ جو ترجمان القرآن کے مضمون کی وجہ سے عوام وخواص میں پیدا ہوچکی ہے" نیز اُس نقصان کا ازالہ بھی پیش نظر ہے جس

کو وہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :-

"آپ نے ابھی تک غالباً اس کا اندازہ نہیں فرمایا کہ آپ کے اس مضمون نے ہماری مختلف جماعتوں میں کس قدر اختلافات پیدا کر دیے ہیں۔ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی جیسے قابل قدر عالم کی شخصیت عوام کی نظروں میں کس درجہ متاثر ہوئی ہے۔"

ان مقاصد سے ہم بھی متفق ہیں علمائے اسلام کی پوزیشن صاف کرنا، اور کسی اسلامی جماعت کے اختلافات کو رفع کرنا اور ایک قابل قدر عالم دین کی شخصیت جو عوام کی نظروں میں متاثر ہو گئی ہے اس کو بحال کرنا، یہ سب فی الواقع ضروری امور ہیں۔ اور اگر اس مضمون سے جو مولوی محمد یحییٰ صاحب نے تحریر فرمایا ہے ایسے اچھے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں تو اس رسالہ کے صفحات اُن کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

میری ذات کے متعلق مولوی صاحب نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے میں ان کی تردید کرنا نہیں چاہتا جن مقاصد کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ لکھا ہے ان سے میں خود اتفاق رکھتا ہوں۔ اور جب ان مقاصد کا حصول ان کی رائے میں اسی قسم کی تحریر پر موقوف ہے تو مجھے اس کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیے۔ مزید براں جس شخص نے "اپنے سے بالاتر ہستیوں پر بیجا اعتراضات کر کے" نام وری حاصل کرنی چاہی ہو اُس کی جھوٹی اور ذلیل ناموری تو اسی قابل ہے کہ اس کو انہی صفحات میں پامال کر دیا جائے جن میں اسے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ رہیں وہ غلط بیانیاں، جو امور واقعیہ کے خلاف اس مضمون میں کی گئی ہیں، تو اُن کی تردید بھی غیر ضروری ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ ناظرین جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ کے پرچوں میں زیر بحث مضامین پھر ایک بار پڑھ لیں میں صاحب مضمون سے بدگمانی نہیں کرتا۔ غالباً جوش کی حالت میں بعض ایسی باتیں بلا ارادہ ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جو واقعات کے خلاف ہیں۔

ذاتیات سے قطع نظر کرتے ہوئے چند امور اس سلسلہ میں قابل گذارش ہیں۔

جس چیز کو غلط کہا گیا تھا اس کے غلط ہونے میں تو اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ خود ان حضرات نے جو اس غلطی کے مرتکب ہوئے تھے اُس سے رجوع فرما لیا ہے۔ رجوع کسی صحیح فعل سے نہیں کیا جاتا، غلطی ہی سے کیا جاتا ہے۔

جس چیز کو بے احتیاطی کہا گیا تھا اس کے بے احتیاطی ہونے سے بھی اب انکار کی گنجائش نہیں اس لیے کہ فتوی سے رجوع کے جس قدر وجوہ ظاہر کیے گئے ہیں ان میں سے ایک وجہ بھی فتویٰ لکھنے کے بعد پیدا نہیں ہوئی، بلکہ تمام وجوہ فتویٰ لکھنے سے پہلے موجود تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مفتیان کرام ان سے بے خبر تھے مگر جس طرح فتویٰ شائع ہونے کے بعد وہ ان سے باخبر ہوئے اسی طرح فتوی لکھنے سے پہلے بھی باخبر ہو سکتے تھے۔ اگر افتاء سے پہلے وہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی جن کی بنا پر بعد میں فتوے سے رجوع کیا گیا، تو ظاہر ہے کہ نہ فتویٰ لکھا جاتا اور نہ یہ فتنہ رونما ہوتا۔ اسی چیز کو بے احتیاطی سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ تعبیر غلط نہیں ہے۔

اب کلام جو کچھ ہے صرف اس امر میں ہے کہ اس غلطی کو غلطی اور بے احتیاطی کو بے احتیاطی کہا کیوں گیا؟ دوسری جماعتوں کے لوگ مذہبی اور قومی معاملات میں غلطی کریں تو ان کو ٹوکو اور ضرور ٹوکو، حتیٰ کہ اگر سب وطعن بھی کر جاؤ تو مضائقہ نہیں۔ لیکن جب ہماری جماعت کے لوگ غلطی کریں تو خواہ وہ کیسی ہی سخت غلطی ہو۔ اور اس سے مصالح امت کو کتنا ہی نقصان پہنچے، اس پر کچھ نہ کہو، کیونکہ وہ اسلامی ہند کی مایۂ ناز ہستیاں ہیں۔ اول تو ان کے ہر فعل کو تمہیں صحیح سمجھنا چاہیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو جو چیز تمہیں غلط نظر آئے اس پر تنقید اور نصیحت اور تنبیہ کرنے کی جرأت نہ کرو کہ یہ گستاخی و بے ادبی ہے تمہیں تو اس پر پردہ ڈالنا چاہیے، بلکہ دوسروں کے سامنے اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے پوری قوت استدلال صرف کر دینی چاہیے لیکن اگر تم ایسا بھی نہیں کر سکتے اور تمہیں غلطیوں پر ٹوکنے کی بیماری ہی ہے تو بدرجہ آخر اتنا تو ضرور ہونا چاہیے کہ اس گروہ کے بزرگوں کو کسی غلطی پر تنبیہ کرنے کے لیے دبی زبان

سے کام لیا جائے۔ لہجہ اور الفاظ اور انداز بیان، ہر چیز میں یہ امتیاز نمایاں ہونا چاہیے کہ اِس گروہ خاص کے لیے یہ زبان ہے، اور دوسرے تمام گروہوں کے لیے دوسری زبان۔

میں نہیں کہتا کہ یہ علمائے کرام کا مطالبہ ہے۔ جو علما صحیح معنوں میں علمائے حق ہیں، ان کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ افرادِ امت سے اس قسم کی گروہ بندی اور شخصیت پرستی کا مطالبہ کریں۔ مگر جس گروہ متبعین کی نمایندگی مولوی محمد یحییٰ صاحب کر رہے ہیں، اس کی ذہنیت یہی ہے۔

مدرسیت کی آب و ہوا میں ایک مدت دراز سے یہی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے۔ اسی ذہنیت نے مسلمانوں میں فرقہ بندی اور طائفی عصبیت اور حمیت جاہلیہ پیدا کی ہے، اور اسی کی بدولت امت مسلمہ ایسے اجزاء میں تقسیم ہو گئی ہے جن میں اتصال و اتحاد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں میں جتنے فرقے بنے ہیں اسی سبب سے بنے ہیں کہ ایک ایک جماعت نے اپنے اپنے اساتذہ اور ائمہ کو غلطی پاک سمجھا، ہر خطا و صواب میں ان کی تقلید کی، ان کی باتوں پر تنقید کی نظر ڈالنا اور آزادیِ رائے کے ساتھ صرف صواب میں اتفاق اور خطا سے اختلاف کرنا گناہ سمجھا۔ اس طریقہ سے رفتہ رفتہ ہر جماعت گویا ایک قوم بن گئی، اس کے ائمہ کے اقوال ایک مستقل مذہب کی بنیاد بن گئے، ان کی غلطیاں بھی مسلماتِ قوم میں داخل ہو گئیں، اور اکابر کے کسی فعل یا ان کے بنا کردہ مذہب کے کسی ادنیٰ جزیہ سے بھی اختلاف کرنا گویا مذہب اور جماعت کی مخالفت کا ہم معنی ہو گیا۔

اس فرقہ بندی کے بعد فرقوں کی جنگ شروع ہوئی۔ ہر فرقہ کے لوگوں نے اپنا یہ اصول مقرر کر لیا کہ جو کچھ ان کے اپنے دائرے میں ہے وہ تو تنقید سے بالاتر ہے، اور اس کی ہر چیز اس قابل ہے کہ اس کی حمایت و مدافعت کی جائے، اور جو کچھ اس دائرے سے باہر ہے اس پر نہ صرف تنقید اور نہ صرف نکتہ چینی جائز ہے، بلکہ ملامت اور سب و شتم بھی کی جا سکتی ہے، اس کی صحیح باتوں کو بھی غلط ٹھیرایا جا سکتا ہے، اس کو ہر قسم کے الزامات بھی دیے جا سکتے ہیں، حتیٰ کہ اس کو دین سے خارج کر دینے

ئی بھی کوئی مضائقہ نہیں ظاہر ہے کہ جب ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر اس ذہنیت کے ساتھ حملہ آور ہوگا، اور دوسرا اسی ذہنیت کے ساتھ جوابی حملہ کرے گا تو احقاق حق اور قبول حق قطعی ناممکن ہوگا۔ جو گروہ اس فرقہ بندی کی فضا میں نشو ونما پاتے ہیں ان کی نظروں پر جماعت اور غیر جماعت کا امتیاز اور طائفی عصبیت کا اثر اس درجہ مستولی ہوتا ہے کہ وہ نہ کسی دلیل سے اپنے گروہ کی کسی غلطی کو تسلیم کر سکتے ہیں، اور نہ اپنے دائرۂ جماعت سے باہر کی کسی حق بات کو قبول کر سکتے ہیں۔ اگر حق ان پر ظاہر بھی ہو جائے تو حمیّت جاہلیہ ان کا دامن پکڑ لیتی ہے۔ اسی لیے ان کے مناظرے ہمیشہ بے نتیجہ رہتے ہیں، بلکہ ہر مناظرہ مزید تلخی اور آتش عصبیت کے مزید اشتعال پر ختم ہوتا ہے، کیونکہ ہر فریق اس تخیل کے ساتھ میدان میں اترتا ہے کہ اپنی ہر بات کی حمایت اور مخالف کی ہر بات کی مخالفت ضروری ہے۔ اگر میں نے اس کی کوئی بات مان لی تو گویا میری اور میرے ساتھ میری پوری جماعت کی شکست ہو گئی، اور مخالف فتح یاب ہو گیا۔

اس عصبیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ کسی خاص گروہ کے ساتھ انتساب رکھتے ہیں ان کی صحیح تنقید اور جائز پند و وعظ میں بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ یہ شخص ایک گروہ کی تو کھلی ہوئی غلطیوں پر بھی خاموش رہتا ہے بلکہ حتی الامکان ان کی حمایت کرتا ہے، اور اس کی زبان جب کھلتی ہے تو دوسرے گروہوں کی خطاؤں پر ہی کھلتی ہے۔ یہ رنگ دیکھنے کے بعد کیونکر ممکن ہے کہ اس کی کوئی بات دائرہ جماعت سے باہر کسی وقعت کی حامل ہو سکے۔ ایسے شخص کو تو حق پرست سمجھا ہی نہیں جاتا۔ وہ صداقت کا نہیں بلکہ ایک خاص جماعت کا نقیب سمجھا جاتا ہے، اور اس کی ہر بات طائفیّت (پارٹی فیلنگ) کے غبار میں گم ہو کر بے اثر ہو جاتی ہے۔

جو شخص قرآن و سنت کی تعلیم اور سلف صالح کے طریقہ پر نظر رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اسلامی ذہنیت ہرگز وہ ذہنیت نہیں ہے جس سے یہ فرقہ بندی اور طائفی عصبیت پیدا ہوتی ہے۔ قرآن تو ہم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ

"والاقربین۔" تم انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے شہادت دو خواہ وہ تمہاری اپنی ذات یا تمہارے ماں باپ یا رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑے" (النساء: ۲۰) وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی۔" اور جب بولو تو انصاف ہی کے ساتھ بولو خواہ وہ تمہارے عزیز قریب ہی کے خلاف کیوں نہ ہو" (انعام: ۱۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ محبت اور بغض اور تائید اور مخالفت جو کچھ بھی ہو خالص حق کے لیے ہو۔ اوثق عری الایمان الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔ من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ ونصح للہ فقد استکمل الایمان۔ الدین النصیحۃ للہ عزوجل۔ مسلمان کے لیے صرف ایک ہی پارٹی کافی ہے اور وہ اللہ کی پارٹی ہے۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اس پارٹی کا اصل الاصول یہ ہے کہ تمہاری موافقت اور مخالفت، تائید اور تردید، دوستی اور جنگ، اتحاد اور اختلاف ہر چیز نفسانیت سے پاک اور اشخاص یا جماعتوں کی الفت و عداوت سے قطعاً مبرا ہو۔ خدا کے دیئے ہوئے علم اور اس کی بخشی ہوئی فکر و نظر کو ان تمام رنگین عینکوں سے پاک رکھو۔ جو بات حق پاؤ اسے بے تامل قبول کرو۔ جو غلط دیکھو اسے بے تکلف رد کر دو۔ جو سیدھے رستے پر جا رہا ہو اس کا ساتھ دو۔ جو غلطی کا مرتکب ہو بے لاگ انصاف کے ساتھ اس کو خطا وار ٹھیراؤ اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرو۔ جس کی موافقت کرو صرف اس حد تک کرو جس حد تک وہ حق اور صداقت پر ہو۔ اور جس سے اختلاف کرو صرف اسی حد تک کرو جس حد تک وہ غلطی پر ہو۔

یہی اسلامی ذہنیت تھی جس نے سید البشر سے کہلوایا تھا کہ والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔" خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" اسی ذہنیت نے افضل البشر بعد الانبیاء سے کہلوایا تھا کہ فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقومونی۔" جب تم دیکھو کہ میں سیدھا چل رہا ہوں تو

میری پیروی کرو اور جب میں ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو"۔ یہی ذہنیت تھی جس کے اثر سے ایک نکٹی چپٹی عورت نے امیر المومنین عمر فاروق کو بھرے مجمع میں مقدار مہر کی تعیین پر ٹوک دیا کہ مَا ذالکَ لک (تم کو ایسا کرنے کا حق نہیں)، اور پھر یہی وہ اسلامی ذہنیت تھی جس کی برکت سے پورے مجمع میں سے کوئی ایک نظر بھی اس ہیچ میرز عورت کی طرف تعجب اور تضحیک کے ساتھ نہ اٹھی، اور کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا کہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مایۂ ناز ہستی کے مقابلہ میں یہ "پیر و مرشد" بننے کی جرأت کس شامت زدہ نے کی ہے، اور کسی نے یہ گمان نہ کیا کہ یہ حقیر ہستی اپنے سے لاکھ درجہ بالاتر شخص کو ٹوک کر نام وری حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہوا صرف اتنا کہ فاروق اعظم نے اس سے دلیل پوچھی، اور جب اس نے اپنی تائید میں نص قرآنی پیش کر دی، تو اس شخص کو جو عرب و شام و فارس کا مطلق العنان بادشاہ، اور تمام اہل ایمان کا امیر، اور علوم شریعت کا امام تھا، ایک ادنیٰ عورت کے مقابلہ میں بھی اپنی خطا کا اقرار کرتے ہوئے ذرا جھجک محسوس نہ ہوئی، اور نہ کسی بے عزتی کا احساس ہوا کیونکہ وہ جاہلیت کی عزت نہ تھی، اسلام کی عزت تھی، جس کو کسی کی نصیحت سے ٹھیس نہیں لگ سکتی اور جو اقرارِ خطا اور رجوع الی الصواب سے گھٹتی نہیں بلکہ اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ہر وہ شخص جس کو دین و ملت کی حقیقی خدمت کرنی ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے اندر یہی اسلامی ذہنیت پیدا کرے۔ اس کو کسی پارٹی اور کسی گروہ کے ساتھ ایسا معاہدہ نہ کرنا چاہیے کہ ہر خطا و صواب اور ہر صعب و سہل میں اس کی موافقت کرے گا، اور نہ کسی کے خلاف یہ عہد کرنا چاہیے کہ تمام امور میں اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کو قائم بالقسط اور شہید للہ ہونا چاہیے۔ اس کو اوثق عری الایمان پر قائم ہونا چاہیے۔ اس کا عدل بے لاگ ہونا چاہیے۔ اس کی حق پرستی پارٹیوں اور اشخاص کی محبت و عداوت سے بالکل پاک ہونی چاہیے۔ وہ صرف حزب اللہ کا ممبر بن کر رہے۔ ہر صحیح بات کی موافقت کرے خواہ وہ کسی کی طرف سے پیش ہو۔ اور ہر غلط بات کی مخالفت کرے بلا لحاظ

اس کے کہ اس کا پیش کرنے والا کون ہے جس حد تک کوئی شخص یا جماعت حق پر ہو وہ بھی اس کے ساتھ رہے اور جہاں کوئی راہ راست سے ہٹے وہ نہ صرف اس سے الگ ہو جائے، بلکہ اس کو حق کی طرف کھینچ لانے میں نصیحت کا پورا پورا حق ادا کر دے۔ مگر مخالفت ہو یا موافقت دونوں میں اسے ٹھیک ٹھیک عدل اور حق پرستی کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ خود کہیں ظالمین میں شامل نہ ہو جائے۔

ایسے شخص کی پوزیشن کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو طائفی عصبیت اور فرقہ بندی کی محدود فضا میں رہتے ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ دشمنی، حسد، بدخواہی اور نفرت و غضب کے جذبات سے پاک رہ کر بھی کسی کی مخالفت کی جا سکتی ہے اور محبت، عقیدت، ارادت، رشتہ داری اور تمام قریب ترین قلبی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے بھی کسی کی خطا پر تنبیہ کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی غلط ذہنی تربیت کی بنا پر اس طرز عمل سے قریب قریب بالکل نامانوس ہو چکے ہیں اس لیے وہ اسے غلط سمجھنے اور بری نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ جس اختلاف کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اسی قسم کا اختلاف ہے کیونکہ سوسائٹی کی علمی ترقی، اخلاقی طہارت، اور درستی معاملات کا انحصار تمام تر ایسے ہی اختلاف پر ہے جس قوم کے سرداروں میں فان زغت فقومونی کہنے والے نہ ہوں اور جس قوم کے افراد میں یہ اسپرٹ نہ رہے کہ خلوص نیت کے ساتھ ٹیڑھا چلنے والوں کو سیدھا کر دیں، وہ قوم کبھی درست نہیں رہ سکتی۔

یہ چند سطریں صرف اس لیے لکھی گئی ہیں کہ آئندہ کے لیے اختلافی امور میں اس رسالہ کی پالیسی واضح ہو جائے۔ اگرچہ پہلے بھی لفظاً و عملاً اس امر کا اظہار کیا جا چکا ہے، مگر اب اظہار سے بڑھ کر اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ رسالہ کسی پارٹی اور کسی فرقہ کا آرگن نہیں ہے۔ نہ کسی گروہ کو اس سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کے ساتھ کوئی اختصاص برتے گا۔ اس کی نظر میں سب مسلمان یکساں ہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں شخصی حیثیت سے ہر ایک واجب الاحترام ہے! مگر مسلک کے اعتبار سے جن امور میں کوئی شخص ہم کو حق پر نظر آئے گا اس کی ہم تائید کریں گے اور جن امور میں

ہم اسے راہ صواب سے ہٹا ہوا دیکھینگے، صرف اسی امر کی حد تک اس سے اختلاف کریں گے، نہ اس لیے کہ اس پر تفوق حاصل کریں بلکہ صرف اس لیے کہ اس پر اور اس کے ہم خیال لوگوں پر راہ صواب روشن ہوجائے اور وہ اس کی طرف رجوع کرکے اپنی عاقبت درست کرے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی لائق اظہار ہے کہ جس شخص کو ہم سے اختلاف ہو۔ اس کے لیے یہ صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ اگر بحث علمی رنگ کی ہوگی اور عصبیت سے پاک ہوگی تو ہم بھی کھلے دل سے اس میں حصہ لینگے اور اگر اس کا مقصد صرف اپنی کسی شکایت کو رفع کرنا ہوگا تو خواہ اس میں ہم پر کتنے ہی سخت حملے کیے جائیں، ہم اس کو بے کم و کاست شائع کردیں گے اور حتی الامکان مدافعت سے پرہیز کریں گے۔ بے لاگ تنقید پر تجارات کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم ان کے لیے خود کوئی راستہ نہ دینگے تو وہ دوسرے راستے نکالیں گے اور مسلمانوں کا بہت سا وقت اور روپیہ فضول پمفلٹ بازی میں ضائع ہوگا۔ لہذا اس فائدہ کی خاطر کبھی کبھی رسالہ کے چند صفحات قربان کردینا ہی مناسب ہے۔

افتاء کے باب میں مصالح امت کی رعایت ملحوظ رکھنے کا جو مشورہ دیا گیا تھا، اس کو محض "سیاسی مصلحت" اور "زمانہ سازی" قرار دیکر ناقابل اعتنا ٹھیرایا گیا ہے۔ دعوی یہ ہے کہ اسلاف کرام نے فتوی دینے میں کبھی "سیاسی مصلحتوں" کا لحاظ نہیں کیا۔ مگر قرآن اور سنت دونوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ شریعت میں جن اہم ترین مصالح سے اعتنا کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی جماعت میں تفرق و اختلاف اور تنازع کا سدباب کیا جائے اور اجتماع قلوب و تالف کی کوشش کی جائے، اور ایسے تمام اسباب کی روک تھام کی جائے جو مسلمانوں کو کسی فتنہ میں مبتلا کرنے والے ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد کعبہ کو بنائے ابراہیمی پر قائم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ مگر کس لیے اس سے باز رہے؟ صرف اس لیے کہ قریش اور اطراف و جوانب کے عرب قبائل ابھی اسلام میں حدیث العہد ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہدم کعبہ کے معنی غلط سمجھیں اور کسی فتنہ میں مبتلا ہوجائیں۔ منافقین مدینہ کے کفر اور عداوت اسلام سے

حضور خوب واقف تھے۔ مگر کیوں ان کے قتل کا فتویٰ نہ دیا؟ صرف اس لیے کہ تنفیر قلوب کا سبب نہ بن جائے۔ لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے اصحاب کو ہلاک کر رہے ہیں۔ قیام مکہ کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جہر بالقرآن سے کیوں منع کیا؟ صرف اس لیے کہ مسلمان جو پہلے ہی مصائب میں گرفتار رہیں اور زیادہ مظالم کے شکار نہ ہوں۔ جہاد کی حالت میں دشمن کے ملک سے متصل اقامت حدود سے کیوں منع کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ شائد کسی ضعیف الایمان شخص کے دل میں دشمنوں سے جا ملنے کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت کمزور ہو۔ ظالم و جابر امراء پر خروج کرنے سے کیوں روکا گیا؟ صرف اس لیے کہ جمعیت اسلامی میں فتنے نہ برپا ہوں۔ کہنے والا چاہے تو ان سب کو "زمانہ سازی" اور "سیاسی مصلحت پرستی" کہہ دے مگر ہم تو اس کو "حکمت" کہتے ہیں جو دراصل روح شریعت ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ شریعت میں مفتی کو مستفتی کی پابندی سے آزاد نہیں کیا گیا ہے "مفتی کا فریضہ ہے کہ جن الفاظ اور عبارات میں اس کے سامنے استفتا پیش کیا جائے اس کے لحاظ سے اور حدود کے اندر شریعت کا مسئلہ پیش کر دے"۔ اور "یہ تو کبھی ممکن ہی نہیں کہ فتویٰ ہی دینے سے انکار کر دے"۔

قرآن و سنت اور سلف صالح کے عمل سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔ مفتی کے لیے جائز ہے کہ جس امر کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے اس کو چھوڑ کر کوئی ایسی بات بتا دے جو سائل کے لیے زیادہ نافع ہو۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (کیا خرچ کیا جائے) قرآن میں اللہ نے فتویٰ دیا۔ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ الایہ۔ تم جو کچھ بھی خرچ کرو والدین اور رشتہ داروں وغیرہ پر خرچ کرو۔ دیکھیے سوال منفق کے متعلق تھا۔ جواب مصرف سے دیا گیا۔ حضور سے پوچھا گیا کہ یہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے۔ اللہ نے جواب دیا يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ یہ تم سے چاند کی کمی بیشی کے باب میں سوال کرتے ہیں۔ تم علم ہیئت کی تعلیم دینے نہیں بھیجے گئے ہو۔ اس کو چھوڑ کر انھیں بتا دو کہ اس کی کمی و بیشی میں تمہارے لیے کیا فائدہ ہے۔ اس کا

فائدہ یہ ہے کہ تمہیں اوقات معلوم ہو جاتے ہیں کہ یہ رمضان ہے، یہ عید آئی یہ حج کا موسم آیا۔

مفتی کے لیے جائز ہے کہ جتنا سوال کیا جائے اس سے زیادہ جواب دے۔ حضور سے پوچھا گیا کہ محرم کیا پہنے۔ آپ نے جواب دیا "قمیص نہ پہنے، عمامہ اور پجامہ نہ پہنے، موزے نہ پہنے۔ ہاں اگر جوتی نہ ہو تو موزے کو ٹخنوں تک کاٹ کر پہن لے"۔ سوال صرف یہ تھا کہ کیا پہنے جواب میں یہ بھی بتا دیا کہ کیا پہنے اور یہ بھی کہ کیا نہ پہنے۔

مفتی کو جائز ہے کہ فتویٰ دینے میں اگر کوئی مضرت محسوس ہو تو فتویٰ دینے سے انکار کر دے حضرت ابن عباس سے ایک شخص نے ایک آیت کی تفسیر پوچھی۔ آپ نے فرمایا "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے تجھے اس کی تفسیر بتا دی تو کہیں تو کافر نہ ہو جائے۔ لہٰذا میں نہ بتاؤں گا"۔ عکرمہ کو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ہدایت کی تھی کہ من سألك عما لا یعنیہ فلا تفتہ "جو شخص تجھ سے کوئی ایسی بات پوچھے جو اس کے لیے فائدہ مند ہو اس کو فتویٰ دو، اور جو فضول سوال کرے اسے فتویٰ نہ دو"۔ عموماً سلف صالح کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو وہ پوچھتے کہ کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دیتا تو فتویٰ دے دیتے اور نفی میں جواب دیتا تو انکار کر دیتے تھے۔ عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا بیان ہے کہ میں نے بیس صحابیوں کو دیکھا ہے ان میں سے ہر ایک فتویٰ دینے کی ذمہ داری سے بچتا اور سائل کو دوسرے مفتی کے پاس جانے کی ہدایت کر دیتا تھا۔ ابن عباس اور ابن مسعود دونوں کا قول امام مالک نے نقل کیا ہے کہ من افتی الناس فی کل ما یسئلونہ منہ لمجنون "جو شخص لوگوں کے ہر سوال کے جواب میں فتویٰ دے وہ مجنون ہے"۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ العجلۃ فی الفتویٰ نوع من الجہل والخرق "فتویٰ دینے میں جلدی کرنا ایک قسم کی جہالت اور بے وقوفی ہے"۔

مفتی کے لیے ضروری ہے کہ جب مسئلہ تفصیل کا محتاج ہو تو تفصیل دریافت کیے بغیر فتویٰ نہ دے کیونکہ مستفتی کبھی اپنی جہالت سے اور کبھی بدنیتی سے پوری صورت حال کو بیان نہیں کرتا جس کی وجہ سے

فتوی غلط ہو جاتا ہے۔ بہت سے مستفتی ناجائز اغراض کے لیے باطل مسئلہ کو مزخرف قالب میں ڈھال کر لاتے ہیں، اور جو مفتی محض سخن الفاظ کے قیدی ہوتے ہیں وہ دھوکہ کھا کر ایسے فتوے دے بیٹھتے ہیں جن سے بڑی مضرتیں مترتب ہوتی ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ واقعہ ہے جو علامہ ابن تیمیہ کے زمانے میں پیش آیا۔ سلطان وقت نے اہل الذمہ کے لیے حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے مختلف لباس پہنیں۔ ذمی اس پر ناراض ہوئے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ انہوں نے استفتار کی عبارت اس طرح مرتب کی کہ "کیا فرماتے ہیں علمار کرام اس بارے میں کہ اہل الذمہ کی ایک قوم پر لازم کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے معتاد لباس کے بجائے دوسرا لباس پہنیں جس کے وہ عادی نہ تھے۔ اس سے ان کو راستوں اور کوچوں میں سخت ضرر پہنچا اور بدمعاشوں کو ان پر جرأت ہوئی اور انہوں نے ذمیوں کو ستانا اور ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ کیا امام اب ان کو پھر وہی پہلا لباس پہننے کی اجازت دے سکتا ہے اور کیا ایسی اجازت دینا خلاف شریعت ہے؟" جو علما مستفتی کے پابند تھے اور حقیقت امر کی تحقیق کرنا اپنا فرض نہ جانتے تھے انہوں نے بے تکلف لکھدیا کہ امام ایسا کر سکتا ہے۔ صورت استفتار بنائی ہی ایسی گئی تھی کہ محض اس کے الفاظ پر نظر رکھنے والا اس کے سوا کوئی اور فتویٰ نہیں دے سکتا تھا۔ جب ابن تیمیہ کے سامنے یہ سوال پہونچا تو انہوں نے قید الفاظ سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالی اور امور واقعیہ کو دیکھکر فتوی دیا کہ اہل الذمہ کو ایسے لباس پر باقی رکھنا ضروری ہے جس سے ان میں اور مسلمانوں میں تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد مستفتی بار بار صورت سوال کو بدل بدل کر علامہ کے پاس لائے اور ہر مرتبہ علامہ نے وہی فتویٰ دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ تفصیل طلب مسائل میں ضروری معلومات حاصل کیے بغیر حکم بیان نہیں فرماتے تھے۔ اس قسم کی ایک دو نہیں بیسیوں مثالیں احادیث میں موجود ہیں۔ مگر ایسا کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ فلاں فلاں مسائل میں فلاں فلاں تفصیلات دریافت کیجائیں

اس کا تعلق مفتی کے تفقہ فی الدین اور حکمت سے ہے۔ اسے خود سمجھنا چاہیے کہ کس امر میں تفصیل دریافت کرنے کی ضرورت ہے اور کس امر میں نہیں۔ اور کس مسئلہ میں کیا کیا امور دریافت کرنا صحیح فتوی دینے کے لیے ضروری ہے۔ جو شخص اتنی سمجھ نہ رکھتا ہو وہ منصب افتار کا اہل نہیں۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "ہمیں تو آج کل کیا اس سے پہلے بھی کسی ایسے مفتی کا نشان نہیں ملتا جس نے عبارت یا قول کو چھوڑ کر نیت پر فتوی دیا ہو"۔ اس کے بعد پوچھا گیا ہے کہ تمہارے پاس نیت کی پیمائش کا کوئی ٹیپ یا ایمان کے وزن کرنے کا کوئی اسکیل ہو تو پیش کرو۔

مجھ کو کسی ایسے مفتی کا نشان نہیں ملا جو نیت سے قطع نظر کرکے نفس قول یا محض صورت فعل پر حکم لگاتا ہو۔ سب سے بڑے مفتی کا فتوی تو یہ ہے کہ انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئٍ مانوی۔ شریعت کا قاعدۂ کلیہ یہ قرار پایا ہے کہ نیت ہی سے فعل کی شرعی نوعیت متعین ہوتی ہے، حتٰی کہ اگر کوئی انسان کوئی ایسا فعل کرے جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے حلال ہو، اور نیت اس کی حرام کی ہو تو فتوی حرمت کا دیا جائیگا۔ اور اس کے برعکس صورت فعل حرام ہو مگر نیت حلال کی ہو تو فتوی حلت پر ہوگا۔ ایک شخص خود اپنے مال کو لے رہا ہے مگر سمجھ یہ رہا ہے کہ غیر کا مال ہے تو مفتی کہے گا کہ وہ فعل حرام کا مرتکب ہوا درانحالیکہ صورت فعل ایسی ہے کہ اس پر حلت کا فتوی ہونا چاہیے تھا۔ ایک شخص تاریکی میں غیر عورت سے مباشرت کرتا ہے مگر سمجھ یہ رہا ہے کہ اس کی اپنی بیوی ہے۔ صورت فعل صریح حرام ہے مگر مفتی کو کہنا پڑے گا کہ وہ فعل حلال کا مرتکب ہوا۔ ایک شخص بیع کا معاملہ کرتا ہے اور نیت اس کی عقد ربو کی ہے۔ کونسا مفتی کہے گا کہ صورت بیع نے اس کو گناہ سے بچا لیا۔

رہا یہ سوال کہ نیت کی پیمائش کا ذریعہ کیا ہے، تو اس پر میں کوئی طویل فقہی بحث نہ کروں گا میرے پاس بیسیوں اقوال ایسے موجود ہیں کہ اگر نفس قول پر رائے قائم کی جائے تو صریح کفر کا حکم لگا دیا جائے۔ مگر قائلین کے نام سن کر آپ حکم کفر کے خیال کو بھی گناہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے لوائی ارفع من لواء محمد۔ بطشی اشد من بطش اللہ۔ جئنا بحراً وقف الانبیاء علیٰ ساحلہ۔ سبحانی ما اعظم شانی۔ کیا محض نفس الفاظ کا اعتبار کر کے آپ ان اقوال کے قائلین کی طرف کفر کو نسبت دینے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو وہ ٹیپ کہاں ہے جس سے آپ نیتوں کو ناپتے ہیں، اور وہ کونسا اکیل ہے جس میں ایمان کا وزن کرتے ہیں؟ کیا وہ قائلین کی عملی زندگی اور ان کے اعمال صالحہ اور ان کے دوسرے اقوال کے سوا کوئی اور چیز ہے؟ کہنے والے نے کہا تھا کہ۔

پنجہ در پنجۂ خدا دارم ۔۔۔۔ من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

ظالموں نے اس قول کے قائل کو کافر کہدیا۔ مگر آپ کے تمام اکابر اُن مکفرین کو ظالم کہتے ہیں اور قائل کا شمار اکابر اسلام میں کرتے ہیں۔ کیوں؟ کس ذریعہ سے انہوں نے معلوم کیا کہ قائل کی نیت اپنے اور خدا کے درمیان نبی کے واسطہ سے انکار کی ہرگز نہ تھی؟ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کو آپ کے اکابر غواص بحر معرفت فرماتے ہیں۔ ان کی کتنی عبارتیں ایسی ہیں کہ اگر محض ظاہر الفاظ پر رائے قائم کی جائے تو ان لوگوں سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں رہتا جنہوں نے شیخ کی تکفیر کی ہے۔ مگر کیوں ان کے اقوال کو مصروف عن الظاہر قرار دے کر ان کی تاویل کی جاتی ہے؟ اور قریب تر آئیے۔ کیا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم رحمہما اللہ اور مولانا اشرف علی تھانوی متعنا اللہ بطول بقاءہ کی عبارتوں میں ایسے فقرے نہیں ہیں جن سے ایک گروہ علماء کو تکفیر و تضلیل کی گنجائش مل گئی ہے؟ نفس عبارت پر حکم لگانے کا جو اصول آپ پیش فرما رہے ہیں وہ

لو مکفّرین کے لیے بہترین ہتھیار ہے۔ مگر یہ آپ ہی کے اکابر ہیں جو ان حضرات کی دوسری عبارتوں سے استدلال
کر کے ان کی صحیح نیت متعین کرتے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ ان سے تینوں کا یہ ٹیپ اور ایمان
کا یہ اکیل چھین لیجیے۔

اسی بنا پر میں عرض کرتا ہوں کہ گروہ بندی ضد پیدا کرتی ہے اور ضد میں انسان حق و باطل
کی تمیز کھو دیتا ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک گروہ کے لیے آپ کے نزدیک جو اصول
حق ہوں، دوسرے گروہوں کے لیے انہی کو آپ باطل ٹھیرائیں۔

صفحہ
17 تا 24
موجود نہیں

صفحہ

17 تا 24

موجود نہیں

صفحہ
17 تا 24
موجود نہیں

صفحہ
17 تا 24
موجود نہیں

صفحه

17 تا 24

موجود نهیں

صفحہ

17 تا 24

موجود نہیں

صفحہ
17 تا 24
موجود نہیں

صفحہ

17 تا 24

موجود نہیں

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ حملہ جائز ہے یا ناجائز، اور جائز ہے تو کن صورتوں میں بلکہ اس وقت ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے کہ ایک قوم نے جو دوسری قوم کے مملوکات پر اس طرح قبضہ کرلیا، آیا یہ قبضہ مفید ملک صحیح ہے؟ یعنی قبضہ کرنے والا کیا قانونی اور مذہبی حیثیت سے اس کا مالک ہوگیا؟ ایک پکے دین دار آئینی مسلمان کو اس سوال کے حل کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آجاتی ہے جس وقت مثلاً فرض کیجیے کہ کسی انگریز کو جنگ میں جرمنی یا اور کسی قوم کا مال ملا اور انگریز اس کو کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ دوسری قوموں کو اس سے بحث ہو یا نہ ہو لیکن مسلمان اپنی کسی ملک کو اس وقت تک صحیح ملک نہیں سمجھتا جب تک کہ اسلامی قانون اس کی صحت کا فتویٰ نہ دے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی شریعت سے پوچھے کہ آیا انگریز جرمنی کے اس مال کا مالک ہوا یا نہیں؟ اگر ہوگیا ہے تو اس کا بیچنا اور ہمارا خریدنا اور خرید کر اپنے تصرف میں لانا صحیح ہوگا۔ لیکن اگر انگریز خود ہی ناجائز مالک ہوا ہے تو اس کو بیچنے کا حق نہیں۔ اور جب اسی کو بیچنے کا حق نہیں تو میں خریدنے کے بعد اس کا کس طرح مالک ہوجاؤں گا؟ بہرحال یہ بین الاقوامی قانون کا ایک نہایت دلچسپ سوال ہے۔ فقہائے اسلامی نے اس کے متعلق مستقل ابواب قائم کیے ہیں اور اس کے جزئیات کی انہوں نے کافی تفصیل کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم[۱] قوم کے مملوکات پر اس طرح قبضہ کیا گیا ہے تو اسلام اس قبضہ کے بعد قبضہ کرنے والے کو مال کا مالکِ صحیح قرار دیتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے:۔

اذا غلب الترك ای کفار الروم　　اگر ترک کے کفار یورپ کے کافروں پر قبضہ پالیں

---

[۱] آئندہ اس کا خیال رہے کہ میں غیر مسلم سے ہمیشہ ان لوگوں کو مراد لیتا ہوں جو مسلمان نہ ہوں اور نہ کسی اسلامی حکومت نے ان کی جان و مال کی ذمہ داری اپنے سر لی ہو۔

فنبوھم واخذوا اموالھم ملکوھا　　اور اُن کو لوٹ لے جائیں۔ ان کے مال لے لیں تو
(ج ۳ ص ۱۵۱)　　وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کے مملوکات پر کامل قبضہ حاصل ہو گیا۔ اس صورت میں بھی امام مالک امام احمد اور ہمارے ائمہ ابو حنیفہ وغیرہ رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے۔

اذا غلبوا علی اموالنا والعیاذ باللہ　　اور اگر کفار ہمارے یعنی مسلمانوں کے مال پر بھی خدا
واحرزوھا بدارھم ملکوھا (ہدایہ)　　نخواستہ قابو پالیں اور اس کو اپنے ملک میں لیجائیں
　　تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

پس یہی نہیں کہ غیر مسلم ایسی صورت میں صرف غیر مسلم ہی کے مملوکات کا جائز اور صحیح مالک ہو جاتا ہے، بلکہ اگر کافر کو مسلمان کے مالوں پر بھی اس طرح کامل قبضہ حاصل ہو جائے تو اسلام اس ملک کی بھی تصحیح کر سکتا ہے اور کافر کو اس مال کا مالک جائز قرار دیتا ہے۔ کیا یہی اسلام کی ناروا داری ہے؟

اموال معصومہ وغیر معصومہ اور ان کی اباحت و عدم اباحت

چونکہ ثانی الذکر مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو دوسرے ائمہ سے اختلاف ہے اس لیے فقہا نے قرآن وحدیث اور مختلف اسلامی مستندات سے اس قانون کے خالص اسلامی قانون ہونے کے نہایت واضح ثبوت پیش کیے ہیں۔ لیکن مضمون طویل ہوتا جاتا ہے اس لیے اس کے نقل کی ضرورت نہیں۔ میں اس موقع پر صرف اس قانونی تنقیح کو پیش کرتا ہوں جس کو قرآن وحدیث سے حاصل کیا گیا ہے:

ان الاستیلاء ورد علی مال مباح　　جائز اور مباح مال پر کفار کا قبضہ ہوا ہے اس لیے
فیعقد سببا للملک (ہدایہ ص ۲۵۵)　　یہ قبضہ ملک کا سبب بن جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا مال مسلمان کے لیے تو بلاشبہ معصوم اور محفوظ ہے ہر مسلمان ذمہ دار ہے کہ دوسرے

مسلمان کے مال کو بلا وجہ نہ لے لیکن غیر قوموں پر یہ قانون عائد نہیں ہوتا اس لیے تو یہ مباح ہوگا۔ چنانچہ قاضی خاں میں ہے

لان العصمۃ من جملۃ الاحکام المشروعۃ کیونکہ عصمت تو ایک اسلامی قانون ہے غیر اسلامی ملک

وھم لم یخاطبوا بھا فبقی فی حقھم مالا کے باشندے اس قانون کے محکوم نہیں ہیں۔ لہذا

غیر معصوم ای ھو مباح یملکونہ (ص ۲۶۷ ج ۴) مسلمانوں کا مال ان کے حق میں معصوم نہیں ہے، یعنی

وہ ان کے لیے جائز اور مباح ہے پس وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

اب قدرتی طور پر تیسری صورت سامنے آجاتی ہے کہ اسی طرح اگر کسی مسلمان نے غیر مسلم مقبوضات

وملوکات پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک ہوگا یا نہیں؟ اسی بین الاقوامی قانون کے اصول سے

اس کا جواب بالکل ظاہر ہے جب غیر مسلم مسلمان کے مال کا مالک ہو جاتا ہے تو آخر مسلم کو بھی یہ حق مذہباً

ودیناً واخلاقاً وقانوناً کیوں نہ دیا جائے گا۔ بدائع میں ہے۔

مَالُ الحَرْبِیِ مُبَاحٌ لانہٗ لاعصمۃ لمال الحربی۔ (ص ۱۳۲ کاسانی) یعنی غیر مسلم جس کی جان و مال کی ذمہ دار کوئی اسلامی حکومت نہیں ہے اس کا مال مباح ہے کیونکہ ایسے غیر مسلم کا مال معصوم نہیں ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جن قوموں نے اپنی جان و مال کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد نہیں

کی ہے، اسلام کی حفاظت اور ذمہ داری سے جنہیں انکار ہے، اگر اسلام بھی ان کی ذمہ داریوں سے

انکار نہ کرے تو آخر وہ کیا کرے؟ تم اگر خدا سے برأت کا اعلان کرتے ہو تو خدا بھی تمہاری جان و

مال کی ذمہ داری سے برارت کا اظہار کیوں نہ کرے؟ اسی لیے قرآن پاک میں ہے:۔

اِنَّ اللہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ شرک کرنے والوں سے خدا بری ہے۔

اس کے سوا کوئی اور صورت کیا ہو سکتی تھی؟ جب دنیا کی تمام قومیں موقع اور قوت پا کر

مسلمانوں کی جان و مال اور ملوکات پر قبضہ کر لیتی ہیں جیسا کہ قرآن کا خود بیان ہے کہ،:۔

وَاِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ وَاَلْسِنَتَھُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ (ممتحنہ)

اگر تم پر ان کو قابو مل جائے تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں اپنے ہاتھ چھوڑیں، زبان سے برائی پہنچائیں، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی خدا کے ناشکر بن جاؤ۔

تو کیا اس قرآنی اور واقعی حقیقت کے بعد یہ ظلم نہ ہوتا، اگر مسلمانوں کا مذہب ان کو بھی اس کی اجازت نہ دیتا؟ قرآن نے اگر اس کے بعد یہ حکم دیا ہے کہ۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (الآیۃ)

مقابلہ کرو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت کے دن کو مانتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اور نہ سچے آئین اور دین کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناتے ہیں ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی۔

تو کیا اس کا مفاد اس کلیہ سے زائد ہے جو ابھی اسلامی فقہا کی تنقیح میں گذر چکا، یعنی مسلمانوں کا مال، مسلمانوں کے مملوکات جس طرح غیر مسلم اقوام کے لیے خود اسلامی قانون کی رو سے مباح ہیں اسی طرح وہ اور ان کے اموال بھی اللہ، اور اس کے رسولؐ کی شریعت اور قانون کی رو سے مباح اور حلال ہیں۔ اگر مسلمان ان پر قبضہ کرلیں گے تو اس کے صحیح مالک اور ہر قسم کے تصرفات کے مجاز و مختار ہوں گے[۱]۔

[۱] یہ خیال کرنا کہ برات اور مقاتلہ کا حکم صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے جو قتالی اور مصافی ہیں، لیکن جو غیر مسلم قوم مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتی اور نہ ان کی ذمی ہے اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے، قرآن اور حدیث سے جہل کا نتیجہ ہے۔ آخر یعد کم احدی الطائفتین میں خدا نے غیر مصافی قافلۂ تجار کا بھی وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ صحابہ کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اگر ایسا کرنا حرام تھا تو قرآن کو ٹوکنا چاہیے تھا۔ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں بھی ابو بصیر صحابی اور ان کے رفقاء کا گذر صرف تجارتی قافلہ کے اموال غیر معصومہ پر ہوا تھا۔ حضرت ابو ذر بھی ایک (بقیہ حاشیہ نمبر ۲۹

عود الی المقصود

بہرحال اصلی بحث یہ تھی کہ غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل کیا ہونا چاہیے۔ اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی بیچ میں ایک مسئلہ کا ذکر آگیا۔ بات تو بہت عام تھی لیکن صحیح خیالات کے لیے مجھے اصل بحث سے تھوڑی دیر کے لیے دور ہو جانا پڑا اب میں پھر اپنے اصلی مدعا کی طرف آتا ہوں۔

تکملہ حاشیہ صفحہ ۲۸ زمانہ میں یہی کھاتے تھے۔ بہرحال قتالی ہو یا غیر قتالی، امیر کا اذن ہو یا نہ ہو، غیر ذمی کفار مباح الدم والاموال ہیں۔ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

ولا نعلم احداً من الفقہاء یحظر (منع) قتال من اعتزل قتالنا من المشرکین۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ایما قریۃ اتیتموھا فاقمتم فیھا فسھمکم فیھا وایما قریۃ عصت اللہ ورسولہ فان خمسھا للہ ورسولہ ثم ھی لکم۔ اس کی شرح میں قاضی عیاض لکھتے ہیں: ان المراد بالقریۃ الاولی ھی التی لم یوجف علیھا المسلمون بخیل ولا رکاب بل اجلی عنھا اھلھا وصالحوا فیکون سھمھم فیھا کما تقرر فی الفئ ۱۲ سبل السلام۔

ترجمان القرآن۔ یہاں مولانا سے بڑی چوک ہوئی کہ انہوں نے محارب Belligerent اور غیر محارب Non-belligerent کے فرق کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ محارب وہ قوم ہے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہو۔ ایسی قوم کا کوئی فرد، اگر وہ بالفعل مقاتل (Combatant) ہو یا نہ ہو، بہرحال اس کا مال مباح ہے۔ ہم اس کے تجارتی قافلوں کو گرفتار کر سکتے ہیں اس کے افراد ہماری زد میں آئیں گے تو ہم ان کو پکڑیں گے اور انکے اموال پر قبضہ کریں گے۔ مولانا نے جتنی مثالیں پیش کی ہیں وہ سب اسی قبیل کی ہیں۔ لیکن جو قوم ہم سے برسر جنگ نہیں، وہ خواہ معاہدہ ہو یا نہ ہو، اس کے اموال ہمارے لیے مباح نہیں۔ قرآن میں تصریح ہے کہ لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ (الممتحنہ ۔ ۱) یہ عین مقتضائے عقل و انصاف ہے۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے لیے مطلقاً ہر غیر ذمی کافر کا مال مباح ہو، جیسا کہ مولانا کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے، تو مسلمانوں کی قوم اقوام عالم کے درمیان امۃ وسطاً ہونے کے بجائے ایک لٹیری قوم بن جائے گی، غیر قوموں پر ڈاکے مارنا اس کا پیشہ قرار پائیگا، (بقیہ سلسلہ حاشیہ بر صفحہ ۳۰)

میں عرض کر چکا ہوں کہ "مستامن مسلمان" کے لیے فرض ہے کہ جس غیر اسلامی حکومت میں وہ امن کی ضمانت لے کر داخل ہوا ہے وہاں کے مروجہ قوانین کی سختی سے پابندی کرے کسی کے مال و جان، عزت و آبرو پر حملہ کر کے قانون وقت کو توڑنا غدر ہے۔ اور غدر قرآناً و حدیثاً و اجماعاً حرام ہے۔ الغرض قانون وقت کی پابندی اس کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قانون ملکی کے خلاف لفافہ میں نصف ماشہ کا بھی اضافہ یا ریل کے سامان میں پاؤ سیر کی زیادتی بھی اس کے لیے ناجائز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ امن پسند قوم مذہبی حیثیت سے کوئی نہیں ہو سکتی ہے

لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ "اسلامی قانون" کی رو سے ایک فعل ناجائز ہے، مثلاً یہی سود کا مسئلہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی دوسرے کا مال لینا اسلام میں قطعاً حرام ہے اگر غیر اسلامی قانون میں اس ذریعہ سے تحصیل مال کی اجازت ہے۔ نہ صرف رعایا کو اجازت ہے بلکہ حکومت بھی بڑے وسیع پیمانے پر مختلف صورتوں میں اس کا کاروبار کرتی ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان کو

بلکہ حقیقتاً [29] اور دنیا میں اس کا وجود ایک بلائے عام بن جائیگا Public nuisance رہا یہ سوال کہ جب غیر مسلم مسلمانوں کے مال پر ظالمانہ قبضہ کر کے اس کا مالک ہو سکتا ہے تو مسلم بھی کیوں نہ اس کے مال پر قبضہ کرنے کا مجاز ہو، تو یہ بھی درحقیقت حالت جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ حالت امن میں اسلام اپنی رعایا کو دوسری غیر محارب قوموں پر ڈاکہ زنی کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہاں اگر دوسری قوم کے افراد مسلمانوں پر ڈاکہ زنی کی ابتدا کریں تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی اور اس وقت مسلمانوں کے لیے ان کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔ قرآن میں جہاں مشرکین سے اعلان برأت کیا گیا ہے وہاں صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (یعنی ظلم کی ابتدا ان کی طرف سے ہوئی تھی) پس مسلمان اپنی طرف سے سلب و نہب کی ابتدا نہ کریں گے۔ بلکہ جب ابتدا دوسروں کی طرف سے ہوگی، تو وہ معاہدہ کی صورت میں فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ پر اور پہلے سے معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں اعلان جنگ پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد تمام قوم حربی قرار پائے گی اور اس کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔

کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اگر وہ "مستامن مسلمان" اس ذریعہ سے اُس ملک کے غیر مسلم باشندے کا مال حاصل کرتا ہے تو نقضِ معاہدہ یا قانون شکنی یا غدر کا وہ قطعاً مرتکب نہیں ہے، اور اس لحاظ سے مذہبی طور پر وہ قانون معاہدہ کا تو قطعاً مجرم نہیں۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ کیا اس نے کسی دوسرے سے ایسے مال کو حاصل کیا ہے جس کے لینے کا گو قانونِ ملکی نے اسے مجاز گردانا ہے، لیکن مذہب یا خدا اُس کے لینے سے روکتا ہے؟ یا یوں کہو کہ کیا اس نے ایسا مال حاصل کیا ہے جو قانوناً نہ سہی لیکن اسلام کی رو سے وہ مباح نہ تھا بلکہ معصوم تھا؟ ابھی شریعت "اسلامی قانون" بلکہ قرآن سے گذر چکا ہے کہ اس قسم کا مال مسلمان کے لیے مذہباً غیر معصوم ہے اور مباح ہے[1]۔ پھر ایک مسلمان کیا کرے؟ قرآن اور مذہب جس کو غیر معصوم اور مباح کہتا ہے کیا وہ اپنے مذہب سے روگردانی کر کے اس کو معصوم اور غیر مباح کہدے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس مال کو نہ قانون ناجائز قرار دیتا ہے اور نہ شریعت حرام قرار دیتی ہے بلکہ اس کے لینے کا حکم دیتی ہے، غریب مسلمان آخر اس جائز کو کس طرح ناجائز اور اس حلال کو کس طرح حرام کر دے؟ کیا وہ سلطنت کے قانون سے بغاوت کرے یا شریعت کے حکم کو توڑے؟ کیا اس کے بعد مسلمان کے لیے کہیں بھی پناہ ہے؟

اسلامی قوانین کا یہی وہ اضطراری مقتضا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے سب سے بڑے محتاط بلکہ بقول بعض عوام، سخت گیر امام، امام الائمہ، قدوۃ الاتقیاء، قائم اللیل، التابعی المجتہد المطلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ نہایت بین اور غیر مبہم واضح لفظوں میں امام محمدؒ نے "سیر کبیر"

[1] ترجمان القرآن۔ یہ اباحت صرف اس صورت میں ہے جبکہ ایک قوم محارب ہو۔ اگر غیر محارب قوم کے مال کو بھی اسی طرح مباح سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان میں کسی غیر مسلم کے مال کو لوٹنے یا چُرا لینے یا رشوت و خیانت کے ذریعے لینے والا مسلمان صرف قانون ملکی کا مجرم ہوگا، اور مذہباً اسے محض اس بنا پر گنہگار سمجھا جائے گا کہ اس نے قانون معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے نہ کہ اُن احکام اسلامی کی جن میں ان افعال کو بجائے خود حرام کیا گیا ہے۔ مولانا کے طرزِ استدلال کا منطقی نتیجہ یہی ہے مگر ہمیں امید نہیں کہ وہ اس نتیجہ کے قائل ہوں گے۔

میں نقل فرمایا ہے:-

واذا دخل المسلم دار الحرب[1] بامان فلا باس بان یاخذ منھم اموالھم بطیب انفسھم بای وجه کان لانه انما اخذ المباح علی وجه عری عن الغدر فیکون ذالك طیباً له۔

(منقول از شامی ظ۲ ج ۴ مطبوعہ مصر)

جب مسلمان دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں امن کا معاہدہ کرکے داخل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں کے باشندوں (غیر مسلم) کی مرضی سے ان کا مال لے خواہ ذریعہ کوئی بھی ہو کیونکہ اس نے ایک مباح مال کو لیا ہے اور ایسے ذریعہ سے لیا ہے جو قانون شکنی (غدر) سے پاک ہے تو یہ مال اس کے لیے پاک اور طیب ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ دار الحرب سے مراد یہاں ایسا ملک ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو جس سے سلطنت اسلامی کا کوئی معاہدہ نہ ہو، اور جہاں سلطنت اسلامی کی مسلم رعایا کے افراد حالت جنگ میں بطور خود امان (Safe eonducts or trade licenses) لے کر غیر معاندانہ کاروبار (Non-hostile intercourse) کے لیے جائیں۔ حنفی قانون کی اس دفعہ کو ایسے دار الکفر پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا جو پورا دار الکفر بھی نہ ہو اور جہاں مسلمانوں کی ایک قوم محاربانہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ علانیہ حیثیت سے آباد ہو اور اسے اپنی حد تک اپنے پرسنل لا کی پابندی کا حق بھی حاصل ہو۔ مولانا کے نظریہ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ہر غیر ذمی کافر کو حربی (Enemy) اور ہر غیر مسلم مقبوضہ کو دار الحرب سمجھ رہے ہیں۔ یہ اسلام کے بین الاقوامی قانون کی بالکل غلط تعبیر ہے غیر مسلم کا مال اور خون صرف حالت جنگ میں مباح ہے، اور وہ بھی اسلامی سلطنت کی رعایا کے لیے نہ کہ خود اُس غیر مسلم سلطنت کی مسلم رعایا کے لیے جس کو آپ حربی قرار دے رہے ہیں حنفی قانون کا منشا صرف اس قدر ہے کہ جب کوئی مسلمان دشمن کے ملک میں امان لے کر جائے تو وہاں وہ عقود فاسدہ پر بیع و شرا کر سکتا ہے۔ یہ اجازت دو وجوہ پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ دشمن کا مال فی الاصل مباح ہے۔ جب اس کو بجبر چھین لیا جاسکتا ہے تو عقد فاسد کے ذریعہ سے حاصل کرنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ جنگ کی حالت ایک اضطراری حالت ہے اور اضطرار میں حرام حلال ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ اس عہد تاریک کا نہیں ہے جس وقت مسلمان محکوم تھے۔ جس زمانہ میں امام رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت سے اس قانونی دفعہ کو پیدا کیا تھا، غالباً اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی مسلمانوں کے اعمال و افعال عقائد و رسوم کی وہ "زشتی" نہ تھی جو "نادر یورپ" کی صورت میں یکایک ظاہر ہو گئی یہاں تک کہ عباد صالحین نے قوم عابدین کو عبادت کے کٹہرے کی طرف بھگانے کے لیے اپنی میراثوں میں، غوثی و قطبی میراثوں میں ان شیروں کو کچھاروں سے چھوڑ دیا جو سب پر رحم کر سکتے ہیں، لیکن جن کا فریضہ عبادت تھا ان کے پاس ان کے لیے کوئی رحم نہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ فقہا جب اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کسی اسلامی مقبوضہ پر فرض کرو کہ غیر اسلامی حکومت قابض ہو جائے تو معاً بطور "جملہ معترضہ" کے "عیاذاً باللہ" کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں، یعنی اس فرض کو بھی وہ فرض کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام اعظم نے

ؒ ترجمان القرآن۔ غالباً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ خیال میں یہ بات بھی نہ تھی کہ جو حکم انہوں نے دشمن کے ملک میں امان لے کر جانے والے مسلمان تاجروں یا سیاحوں کے لیے بیان کیا تھا اس کو غیر اسلامی مقبوضات میں مستقل رہنے والے ان کروروں مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے گا جو غیر مسلم حکومت کے ماتحت اتنی آزادی ضرور رکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشی و عمرانی قوانین کی پابندی کر سکیں۔ امام صاحب نے جو قانون بیان فرمایا ہے وہ صرف ایسے دار الحرب (Belligerent Country) کے متعلق ہے جس میں کوئی مسلمان کاروبار کے لیے امان لے کر جائے۔ ان کا یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ مسلمان جہاں غیر مسلم حکومت کے تحت ایک کثیر تعداد میں مستقل بود و باش رکھتے ہوں وہاں وہ اسلام کے معاشی قانون سے آزاد ہیں اور جن مالی معاملات کو اسلام نے حرام کیا ہے وہ سب وہاں کیے جا سکتے ہیں۔ ایسی جگہ تو مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نہ صرف سرمایہ داری نظام سے بچیں بلکہ اپنی پوری اجتماعی قوت اس نظام کو توڑنے اور اسلام کے معاشی نظام کو قائم کرنے میں استعمال کریں۔ لیکن مولانا جس طریق پر اسلامی قانون کی تعبیر فرما رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنی قومی طاقت کو سرمایہ داری نظام کے استیصال پر صرف کرنے کے بجائے خود اسی نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔

کسی وقت ضرورت کے آگے نہیں بلکہ کتنی شریعت کی مجبوریوں کے آگے گردن جھکا دی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس فتوے کی عملی تصدیق صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ جس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم و ایران کی باہمی آویزشوں کے زمانہ میں قرآن مجید کی پیش گوئی پر اصرار کرتے ہوئے ایک غیر اسلامی ملک یعنی مکۂ مکرمہ میں (جو اس وقت حکومت اسلامیہ کے تحت تھا) قریش سے یہ شرط لگائی کہ قرآن ہی کی پیش گوئی پوری ہو گی تو جب وہ پوری ہوئی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے اونٹ لینے کا حکم دیا اور یہ اونٹ وارثوں سے وصول کیے گئے (ترمذی) فقہاء اسلام اس عمل سے اس اسلامی قانون کی توثیق کرتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شرط "صریح قمار (جوا)" ہے جس کی حرمت قطعی نصوص سے ثابت ہے۔[1]

دار الحرب میں سود حلال نہیں بلکہ فے حلال ہے

لوگوں میں یہ عجیب بات مشہور ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں سود حلال ہو جاتا ہے، اور زیادہ تر اصل مسئلہ کے نہ سمجھنے میں یہی تعبیر مانع آتی ہے ورنہ مسئلہ کی بنیاد جس قرآنی قانون پر ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ جو چیز حرام تھی وہ کسی وقت حلال ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو چیز ہمیشہ سے حلال تھی وہی حلال ہوئی۔ خدا جس چیز کو حلالاً طیباً فرماتا ہے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی کو طیب فرماتے ہیں، ورنہ ایک مسلمان کو اس کا کیا حق ہے کہ قرآن جس چیز کو حرام کرے اسے وہ اپنی رائے سے یا کسی معمولی ظنی خبر کی بنیاد پر حلال کر دے

[1] ترجمان القرآن۔ ترمذی میں تصریح ہے کہ یہ شرط اس زمانہ میں ہوئی تھی جب تحریم رہان کا حکم نہیں ہوا تھا تفسیر ابن جریر میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے۔ پھر تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اس شرط کا مال ابی بن خلف کے ورثاء سے وصول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا حضور نے فرمایا کہ اسے صدقہ کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مال مکروہ تھا۔ دشمن سے لے لیا گیا مگر اسے خود اپنے استعمال میں لانا پسند نہ کیا گیا۔

خصوصاً وہ جو واحد خبروں سے نص پر اضافہ کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ علاوہ اسی وجہ کا ان (قانون وقت کے جس جائز کردہ ذریعہ سے بھی وہ مال ملتا ہو) کی عمومیت کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سود ہی کو نہیں بلکہ قمار (جوا)، کے ان ذرائع سے بھی تحصیل مال کو طیب قرار دیا ہے جس کی قانون وقت میں ممانعت نہ ہو شلاً یہی بیمہ ہے یا لاٹری انشورنس کا ذریعہ ہیں۔ علمار اسلام کے نزدیک

ف ترجمان القرآن۔ دارالحرب کے جو احکام فقہ حنفی میں حالت جنگ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ہندوستان پر چسپاں کرکے مولنا سخت غلطی کر رہے ہیں اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہندوستان میں جوے اور لاٹری اور ریس کے ذریعہ سے بھی مسلمان روپیہ کما سکتے ہیں اور یہ مال ان کے لیے طیب ہے۔ اگر اسی پر فتویٰ ہو جائے تو معاشی حیثیت سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں قطعاً کوئی فرق نہ رہے گا اور جہاں تک معاشی زندگی کا تعلق ہے، تمام مسلمانان ہند غیر مسلم ہو جائیں گے۔ اصلی غلطی یہ ہے کہ مولانا ہر اس غیر مسلم کے مال کو مباح سمجھ رہے ہیں جس کی ذمہ داری کسی اسلامی حکومت نے نہ لی ہو۔ حالانکہ اس نظریہ کی تائید قرآن و حدیث کے کسی حکم سے نہیں ہوتی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ایسے دارالکفر کو جو من وجہ دارالکفر اور من وجہٍ دارالامن اور دارالاسلام ہو چکا ہو، دارالحرب قرار دے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف سوءِ تعبیر ہے بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے نہایت مہلک بھی ہے۔ ہندوستان اس وقت دارالحرب تھا جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض تھا یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جانیں لڑاتے۔ یا اس میں ناکام ہونے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے لیکن جب وہ مغلوب ہو گئے، انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول کر لیا تو اب یہ ملک دارالحرب نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہاں تمام اسلامی قوانین منسوخ نہیں کیے گئے ہیں۔ نہ مسلمانوں کو احکام شریعت کے اتباع سے روکا جاتا ہے نہ ان کو اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے ملک کو دارالحرب ٹھیرانا اور ان رخصتوں کو نافذ کرنا جو محض دارالحرب کی مجبوریوں کو پیش نظر رکھکر دی گئی ہیں۔ اصول قانون اسلامی کے قطعاً خلاف ہے، اور نہایت خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں اسلامی قوانین پر عمل درآمد کرنے کے جو اختیارات حاصل ہیں ان سے بھی وہ خود بخود دست بردار ہو جائیں گے، شریعت کے جو حدود اس وقت ان کے قومی وجود کی حفاظت کر رہے ہیں، وہ بھی باقی نہ رہیں گے اور مسلمان غیر اسلامی نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے تعجب ہے کہ مولنا نے اپنے مضمون کے ابتدائی حصہ میں تو مسلمانوں کے اندر یہ روح پھونکنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی اجتماعی قوت سے کام لے کر غیر مسلموں میں نظام اسلامی کے اصول پھیلانے کی کوشش کریں اور غیر اسلامی نظام کے طلسم کو توڑنے کے لیے ایک اقدامی طرز عمل (forward policy) اختیار کریں مگر آگے بڑھ کر انہوں نے مسلمانوں کو پسپائی کا درس دینا شروع کر دیا۔ انتہائی اضطرار کی حالت میں مسلمانوں کے ایسے منتشر افراد کو جن کی کوئی اجتماعی طاقت نہ ہو، اور جو معاندین کے درمیان گھرے ہوئے ہوں، اسلام اپنے قانون کی

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۶

قمار اور سود کی یہ مرکب شکل ہے لیکن سیر کبیر میں امام محمدؒ امام اعظمؒ سے ناقل ہیں۔

او اخذ مالاً منهم بطريق القمار فذلك كله طيب ؛ — اگر ان سے (غیر مسلموں سے) جوے کے ذریعے مال لے گا تو یہ سب اس کے لیے پاک اور طیب ہے،

سود کی شہرت کا سبب غالباً امام مکحول (جو محدثین کے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں)، کی وہ مرسل حدیث ہے جو اسی مسئلہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے :۔

عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا ربوٰ بين الحربي والمسلم (اسنده بيهقي) — مکحول سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حربی (غیر مسلم)، اور مسلمان کے درمیان سود نہیں ہے

لوگ نہ معلوم اس کا مطلب کیا سمجھتے ہیں ورنہ ظاہر الفاظ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ مسلم اور غیر ذمی نامسلمان کے درمیان اگر سود کا معاملہ ہو تو وہ سود سود ہی نہ ہوگا بلکہ "قرآنی قانون اباحت" کے تحت یہ مال مسلمان کے لیے طیب و حلال ہے۔

بہر حال اسلامی شریعت، قرآن و حدیث، عمل صحابہ کی رو سے یہ ایک ایسا واضح اور صاف قانون ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگ مکحول کی حدیث مرسل کے متعلق حجیت و عدم حجیت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیزیں تو تائید میں پیش کی جاتی ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اموال کے طیب و حلال ہونے کا حکم تو قرآن کے نصوص صریحہ کی واضح عبارت کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵

گرفت ڈھیلی کر کے چند رخصتیں عطا کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ اس حالت میں قیام نہ کرو، بلکہ بعجلت ممکنہ دارالاسلام کی طرف واپس آجاؤ۔ مولانا ان رخصتوں کو ایسی قوم کے لیے عام کر رہے ہیں جو اتنی بڑی عظیم الشان تعداد میں ہے اور مستقل طور پر اس ملک میں متوطن ہے۔ دارالحرب کے احکام ایسی قوم کے لیے ہرگز نہیں ہیں اس کو تو صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جن احکام اسلامی پر عمل کرنا ممکن ہو ان پر عمل کرے، بلکہ دارالکفر کو دارالاسلام بنانے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرنی چاہیے۔

نتیجہ ہے۔ علامہ ابن ہمام نے بالکل صحیح لکھا ہے:۔

وفی التحقیق یقتضی انہ لو لم یرد مکحول اجازہ النظر المذکور۔ (فتح القدیر ج ۷، ص ۱۷)

اور تحقیق کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر مکحول کی روایت نہ بھی وارد ہوتی تو مذکورہ بالا "نظر" اس کی اجازت دیتی ہے

صاحب بدائع نے اسی بنیاد پر امام ابو حنیفہ رح کے مذہب کی صحیح تعبیر یہ کی ہے:۔

وعلی ہذا اذا دخل مسلم او ذمی دار الحرب بامان فعاقد حربیا عقد الربا او غیرہ من العقود الفاسدۃ فی الاسلام جاز (ص ۱۳۲ ج ۷)

اور اس بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسلمان یا ذمی دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں امن کا معاہدہ کرکے داخل ہوا اور کسی غیر مسلم نے ربوٰا (سود) کا معاملہ کیا یا اس قسم کا کوئی معاملہ کیا جو اسلامی قانون کی رو سے فاسد ہو تو وہ معاملہ جائز ہوگا۔

فیٔ اور پھاؤ کی اصطلاح اور اسی لیے میرا ناچیز خیال ہے کہ اس قسم کی تمام "آمدنیاں" جو مسلمانوں کو غیر اسلامی حکومتوں میں قانوناً میسر آسکتی ہیں، ان کو بجائے سود یا قمار یا جوا وغیرہ کہنے کے مناسب ہوگا کہ اس کا خاص نام "فیٔ" رکھدیا جائے جس کے معنی گویا یہ ہوں گے کہ وہ مال جو بغیر کسی حرب وقتال، جنگ وجدال کے دوسری اقوام سے امن پسندانہ طور پر قانون وقت کی پوری پابندی کے ساتھ مسلمانوں کو ملا ہے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ہندی میں ایک لفظ پھاؤ کا ہے جو

؎ شامی میں ہے وما اخذ منھم بلا حرب ولا قہر کالھدیۃ والصلح فھو لا غنیمۃ ولا فیٔ وحکمہ حکم الفیٔ: ص ۲۵

اور جو کچھ ان سے بغیر جنگ اور زبردستی کے لیا جائے مثلاً خراج یا مال صلح، تو وہ نہ غنیمت ہے اور نہ فیٔ بلکہ اس کا حکم فیٔ کا حکم ہے۔

فتح القدیر میں ہے۔ فکان ہذا اکتساب مباح من المباحات کالاحتطاب والاصطیاد۔۔

یہ اکتساب مباحات میں سے ہوگا جیسے لکڑیاں چننا اور مچھلیاں پکڑنا۔ بقیہ حاشیہ بر ص ۳۸

قریب قریب "فے" کا ہم تلفظ بھی ہے، اور غالباً ایک حد تک اسی معنی کو ادا بھی کرتا ہے۔ خواص تو ان آمدنیوں کو اپنی "فے" کی آمدنی کہیں گے، عوام کی زبان پر "ف" نہ چڑھے گی تو وہ اس کو "پھانُو" کہدین گے۔ اس تعین اصطلاح کی ایک بڑی ضرورت وہ وجہ بھی ہے جو بعض ثقات اسلام کی جانب سے اس مسئلہ کے متعلق بطور اندیشہ یا خطرے کے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس مسئلہ کا اعلان کر دیا گیا تو ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد مسلمان اس کو بھول جائیں گے کہ سود قمار اور از قبیل دوسرے ذرائع ان کی شریعت میں حرام بھی تھے یا نہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ان آمدنیوں کا نام "فے" رکھا جائے کہ اس لفظ سے مسلمانوں کو یہ یاد آتا رہے گا کہ غیر اقوام سے ان کے شرعی تعلقات کیا ہیں اور غیر اسلامی حکومتوں کے معاہدۂ امن کی تحمل آن شرعاً کس حد تک لازم ہے[۲]۔ آخر جن کاروباری معاملات سے خدا ناراض نہیں ہے، قانون خوش، حکومت خوش، دینے والے خوش، لینے والے خوش، ان کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کس چیز سے ڈرنا چاہیے۔

(باقی)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳
[۱] کی تعریف سبل السلام میں ہے ھو ما حصل للمسلمین من اموال الکفار من غیر حرب ولا جھاد — وہ مال جو مسلمانوں کو کفار کے اموال میں سے بغیر جنگ و جہاد کے حاصل ہو۔

اور اراضی بنی نضیر کے متعلق خود قرآن میں ہے:-

مَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ — جس پر تم نے دوڑ دھوپ نہ کی ہو نہ گھوڑوں سے نہ اونٹوں سے۔

تمام احادیث کی کتابیں معمور ہیں کہ اس فے کی آمدنی سے اہل بیت نبوت کے ذاتی مصارف پورے ہوتے تھے۔ ۲

[۲] ترجمان القرآن۔ قرآن کی اصطلاح میں فے صرف اس مال کو کہتے ہیں جو بر سر جنگ قوم سے بغیر قتال کے حاصل ہو۔ سورہ حشر پڑھ جائیے۔ تمام ذکر حالت جنگ کا ہے۔ بنی نضیر پر چڑھائی کی گئی۔ کارزار کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ مرعوب ہو گئے اور انہوں نے جلاوطن ہونا قبول کیا۔ اس موقع پر جو اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آئے ان کو فے کہا گیا۔ یہ اصطلاح اُن اموال پر کیونکر چسپاں ہو سکتی ہے جو حالت امن میں غیر محارب کافروں سے سود اور قمار بازی اور سٹے اور دوسرے غیر اسلامی طریقوں سے حاصل کی جائے۔ پھر اگر یہ فے بھی ہو تو افراداً فرداً فرداً اس کو کیسے کھا سکتے ہیں۔ اموال فے کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ وہ حکومت کے خزانے میں داخل کئے جائیں اور ان کو عام مصالح اسلامی پر صرف کیا جائے۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الحشر:۱)۔

بنیادِ تمدّن

از جناب مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی

فرنگستان کے موجودہ سیاسی مفکرین میں ایک ممتاز نام آکسفرڈ کے جوزف ٹوائینی کا ہے۔ اجتماعی و تمدنی مباحث پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور قوم ونسل کے علمی مسائل پر ایک ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں۔ (Encyclopaedia of Religions and Ethics) (ادیان و اخلاقیات کے دائرۃ المعارف) کی ضخیم و مستند مجلدات میں عنوان "نسل" (Race) پر مبسوط مقالہ انہیں کے قلم سے ہے۔ مقالہ کے اندر ہر صاحب فکر کے لیے بہت سی بصیرتیں موجود ہیں۔

وہ کہتے ہیں، کہ قرون وسطی میں جب رومی یا لاطینی کلیسا نے مسیحیت کی منادی شروع کی تو عالم انسانیت کو کل دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مسیحی اور غیر مسیحی۔ مسیحی تو وہ جو فی الواقع اور فی الحال مسیحی ہیں، اور غیر مسیحیوں کی تعبیر اس نے یوں کی، کہ بالفعل نہ سہی، بالقوۃ تو یہ بھی مسیحی ہیں۔ یعنی گو اس وقت منکر ہیں۔ لیکن صلاحیت تو بہرحال ان سب میں قبول مسیحیت کی موجود ہے، اور تبلیغ کے اثر سے ان کا مسیحی ہو جانا دائرہ امکان میں ہے۔ ان کے اور مسیحیوں کے درمیان کوئی ابدی تفرقہ قائم نہیں، کوئی دائمی و لازوال حجاب نہیں۔ چنانچہ جو جو قومیں مسیحیت قبول کرتی گئیں، اپنے پیش رو مسیحیوں کی معاشرتی و اعتقادی زندگی اختیار کرتی گئیں۔ ان کے اور قدیم مسیحیوں کے درمیان کوئی فرق کسی قسم کا قائم نہ ہوا۔

ہوتے ہوتے اصلاح کلیسا کا زمانہ آیا۔ قدیم کیتھولک مذہب، اور پاپائے روم کے خلاف

بغاوت شروع ہوئی، اور مارٹن لوتھر کے اثر سے پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ اب اہل یورپ کے فتوحات کا رقبہ وسیع ہوا، اور بحری ترقیوں کی بنا پر ایسی ایسی نئی قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہوا، جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کی جلد کا رنگ، یورپ والوں کے رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت کے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ ہی یورپ میں نہ تھا۔ آب و ہوا ان کے ملکوں کی، یورپ کے مالک سے بالکل مختلف تھی۔ یہ نیا تجربہ یورپ والوں کے لیے ایسا ہی تھا، جیسا اہل یونان کو اول اول مصر سے سابقہ پڑنے پر پیش آیا تھا۔ لیکن یورپ کے دماغ نے اس سے جو اثر قبول کیا، وہ اس سے بالکل مختلف رہا، جو اہل یونان کے دماغ نے اپنے زمانہ میں قبول کیا تھا۔

یونانیوں نے استدلال یوں کیا تھا، کہ باشندوں میں اگر اس قدر اختلاف ہے، تو خود اُن ملکوں میں بھی تو اسی قدر اختلاف موجود ہے، اور اس لیے انسان کے ظواہر کا یہ سارا اختلاف نتیجہ ہے اختلاف احول کا، ورنہ حقیقت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ جوں جوں ماحول میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی نسبت سے خواص بشری میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے، اور شدید سے شدید اختلافات کے عقب میں بھی بہرحال ایک وحدت کا وجود ہے۔ اہل یورپ پر اس کے برعکس، اپنے نئے سابقہ والوں کی اجنبیت کا دھکا ایسا بیٹھا کہ اس کھلی ہوئی توجیہہ، یعنی اختلاف ماحول کی طرف ان کا ذہن ہی نہ منتقل ہوا، نہ اس امر کی طرف کہ تمدن و معاشرت کے اختلاف کا ہر بڑے سے بڑا منظر بھی بہرحال تدریج ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پس ظواہر کے اختلافات سے وہ ایسے متحیر و مبہوت ہوئے کہ عوارض کو اصل قرار دے لیا، اور ظواہر کو حقیقت کی جگہ پر رکھدیا۔ ان کے ذہن میں صورت استدلال یوں آئی کہ یہ تو ممکن ہے، حبشی مسیحی مذہب قبول کرلے، لباس اور معاشرت بھی یورپی اختیار کرلے، لیکن اپنے رنگ کو کیا کرے گا، یہ تو بہرحال اس کے اختیار کی چیز نہیں۔ گورا،

زندگی بھر گورا ہی رہے گا، اور کالا مدۃ العمر کالا۔

یہ اختلاف رنگ کی اہمیت یورپین دماغ پر اس درجہ مسلط ہوی کہ اس کا مطلق کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور رنگ کو گویا مستقل "نوعی" اختلاف کی بنیاد قرار دیکر اُس نے انسانیت کی تقسیم مہذب و غیر مہذب دو حصوں میں کر دی۔ اب نئے نظریہ کے مطابق دنیا کی آبادی مسیحی وغیر مسیحی میں تقسیم نہ رہی۔ بلکہ اب دو صنفیں، گوری قوموں اور کالی قوموں کی قرار پاگئیں جن میں سے ایک کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اپنے ارادہ سے، اپنے اختیار سے، کام لے کر دوسری میں داخل ہو سکے۔ اس تقسیم کے بعد، خود یورپ کی ذہنیت بھی غیر متاثر نہ رہی۔ اور جس طرح یونانیوں کے اس نظریہ کے بعد کہ مصریوں کا مختلف تمدن، مختلف ماحول کا نتیجہ ہے، خود یونانیوں میں قومی عصبیت ہلکی پڑ گئی تھی، اور اس کی جگہ نرمی، فراخ دلی، اور رواداری زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ اسی طرح یورپ کی ذہنیت پر، اس گوری اور کالی انسانیت کی ناقابل اتصال و ناقابل انضمام تفریق کا اثر یہ پڑا، کہ اس کی قومی اور نسلی عصبیت اور زیادہ گہری ہو گئی، اور غیر یورپی قوموں سے اختلاط کا امکان ہی جاتا رہا۔

یہاں تک مقالہ نگار کے مطالب اپنی زبان میں ادا کر دیے گئے، آگے جو کچھ آرہا ہے، اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے، کہ عبارت بھی حتی الامکان، مقالہ نگار ہی کی قائم رہے۔ ترجمہ لفظی اب بھی نہ ہو گا لیکن بہر حال ترجمہ ہو گا۔

"مسیحی دنیا ایک زمانہ میں اپنے اندر جو اندرونی اتحاد اور بیرونی قوت جاذبہ رکھتی تھی، اس کا صحیح اندازہ، موجودہ اسلامی دنیا سے موازنہ کرنے سے ہو سکتا ہے، اسلام جو مسیحیت ہی کی ایک ادنیٰ درجہ کی نقل ہے، اور نشو و نما بھی جس کا بہت دیر میں ہوا) مغربی افریقہ ہو یا ہندوستان، مسیحی مبلغ سے بڑھ کر عملی کامیابی حاصل کر لیتا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغ، نو مسلموں کو حقیقۃً اپنے طبقہ میں شامل کر لیتا ہے،
معاشرت میں ان سے برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور اپنی لڑکیوں کو انھیں بیاہ دیتا
ہے۔ اس کے برعکس یورپی مبلغ، اسی تفریق رنگ کی بنا پر "دیسی" مسیحیوں سے ویسا ہی
اجنبی و بیگانہ رہتا ہے، جیسا کہ غیر مسیحی کافروں سے۔ اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ
ایک "دیسی" کلیسا کا انتظام کر سکتا ہے، یورپی آبادی سے بالکل خارج۔

یہ آخری خط کشیدہ فقرے خدا جانے ڈاکٹر امبید کار اور دوسرے اچھوتوں کی نظر سے بھی کبھی گذرے ہیں، جو اپنی پستی اور ذلت کا احساس کر کے ایک نئے دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یاد رہے کہ ابتدائی غیر خط کشیدہ فقروں کی طرح یہ عبارت ایک یورپی مسیحی کے قلم سے ہے جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ دوستی کا نہیں دشمنی کا ہے۔

اب آگے جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کے خوش ہونے کے لیے نہیں، عبرت و نصیحت حاصل کرنے اور غور کرنے کے لیے ہے۔

"البتہ یہ ملحوظ رہے کہ جو مسلمان آبادیاں یورپی تمدن کی سطح کے قریب ترین آچکی ہیں، خود وہ بھی اپنی اسلامی (پان اسلامک) اخوت کو ختم کرتی جاتی، اور یورپ طرز کی وہ قومیت اختیار کرتی جاتی ہیں جس کی بنیاد وحدت لسانی پر ہے۔ چنانچہ شام کے عربوں میں اس جذبہ قومیت کا حاصل یہ نکلا کہ ان کے، اور ایرانیوں اور ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان منافرت قائم ہو گئی۔ اور اس نقصان کی تلافی یوں ہوئی کہ عربی زبان بولنے والے مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان منافرت کا حجاب اٹھ گیا۔ ادھر عثمانی ترکوں[1] میں جو قومیت نمو پا رہی ہے۔ وہ خالص افتراقی قسم کی ہے۔ ۱۹۰۸ء کے قبل تک، سلطنت عثمانیہ میں،

[1] واضح رہے کہ مقالہ مصطفیٰ کمال کے دور سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔

قرون وسطیٰ کے مسیحی ممالک کی طرح، برسر اقتدار وہ طبقہ تھا، جو اپنے میں بلحاظ حقوق، شمار و شامل اپنے ملک کے اُن سارے لوگوں کو کر رہا تھا، جو اس کے ہم مذہب ہوں، خواہ یہ ہم مذہبی ارثاً حاصل ہوئی ہو، یا حال میں بذریعہ تبلیغ۔ نوجوان ترک پارٹی جب برسر اقتدار ہوئی، تو اُس نے اس اخوت اسلامی کے بجائے عثمانیت کا پروگرام پیش کیا یعنے اشتراک کی بنیاد بجائے مذہب اسلام کے، ترکی زبان کو قرار دیدیا۔ اور عثمانی حدود ملک سے ان تمام لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ جن میں عثمانیت نہ طوعاً پیدا ہو سکی، نہ کرہاً۔ جنگ یورپ کے دوران میں ترکی میں، جو نسلی مقدمات چلے، وہ جس طرح ارمنی مسیحیوں کے خلاف تھے اسی طرح عرب مسلمانوں کے خلاف بھی تھے۔ اور گو ارمنوں کو حسب دستور قدیم اب بھی اسلام قبول کرنے کا موقع دیا جاتا رہا، لیکن اب اسلام قبول کرنے کے بعد ہونے یہ لگا، کہ اگر وہ عورتوں اور بچوں کے محض چند افراد ہوتے تو انہیں ترکی خاندانوں کے حوالہ کر دیا جاتا، اور اگر پورے گاؤں یا قصبوں کی آبادیاں ہوتیں، تو ان کے ساتھ بھی اسی سختی کا برتاؤ رہتا جس طرح اسلام نہ قبول کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ پوری پوری آبادیاں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی زبان قدیم قائم رکھتیں، جیسا کہ بوسینا کے سلافی نسل والے، اپنی علحدہ زبان (جب سے پندرہویں صدی میں سب کے سب مسلمان ہو گئے) اب تک رکھتے چلے آئے ہیں۔ وحدت دینی جو اشتراک معاشری کی بنیاد آبا و اجداد کے وقت سے چلی آتی تھی، اس سے نوجوان ترکوں کو کوئی غرض ہی نہ تھی جب کہ وہ وحدت دینی، اختلاف ظواہر کو نہ مٹا سکے جو جدید اور نازک قومی احساس کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے"۔

اس کے بعد مقالہ نگار آخر میں دو سوالات پیش کرتا ہے:۔

"موجودہ احساس قومی کے اس تاریخی ارتقاء کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے زیادہ ترقی پذیر مسلم آبادیوں نے آخر اس قومیت کا اثر کیوں اتنا زیادہ قبول کرلیا ہے، جو حقیقۃً ایک تنزلی تحریک ہے؟ اور اگر اس کا سبب تقلید یورپ کو قرار دیا جائے تو پھر یورپ، قرون مظلمہ سے لے کر اب تک کیسے ایسی مسلسل ترقی، اس انحطاط انگیز تحریک کے باوجود، کرتا چلا جا رہا ہے؟"[1]

مقالہ نگار نے جواب جو کچھ دیا ہو، اس سے یہاں غرض نہیں۔ سوال تو آپ کے سوچنے کا ہے۔ کیا آپ کے قرآن نے آپ کو یہ پیام نہیں سنا دیا تھا کہ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (نساء ۔ ع ۱) — اے انسانو۔ ڈرتے رہو اپنے پروردگار سے جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

اور جس نے پھر اسی حقیقت کو یوں ظاہر کیا تھا، کہ

هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (انعام، ع ۱۲) — وہ پروردگار وہی تو ہے، جس نے تم (سب) کو پیدا کر دیا ایک ہی شخص سے۔

اور پھر اسی پیام کو یوں یاد دلایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (اعراف ع ۲۴) — وہ خدا وہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا ایک ہی شخص سے۔

[1] ترجمان القرآن: لطف یہ ہے کہ مسلمان تو اسلام سے ہٹ کر نسلی، جغرافی اور لسانی قومیتوں کا سبق سیکھ رہے ہیں۔ اور یورپ میں اب اس قومیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ آج یورپ میں زبان اور خون اور رنگ کی وحدت کے بجائے ایک سسٹم اور ایک تخیل کی وحدت پر قومیت کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔ ایک طرف اشتراکی نظام کو ماننے والے ایک قوم بن رہے ہیں۔ دوسری طرف فاشزم پر ایمان رکھنے والے ایک دوسری قوم بن رہے ہیں۔ شاید اہل شرق نے قسم کھائی ہے کہ جن جن کڑوے نوالوں کو اہل مغرب تھوکتے جائیں گے انہیں کو یہ لپک لپک کر منہ میں رکھتے جائیں گے۔

اور پھر فرمایا :-

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (زمر ع ۱) پیدا کیا تم (سب) کو ایک ہی جان سے۔

اور کیا قرآن نے ایک آدھ بار نہیں دس بیس بار، یا ایھا الناس کا خطاب دوہرا کر یہ حقیقت واضح نہیں کر دی ہے، کہ تمام نوع انسان، اصلاً ایک ہے، وحدت انسانی، اساسی و فطری ہے جغرافی، لسانی، نسلی، لونی، ساری تقسیمات محض فرعی و ضمنی ہیں۔ اچھے، اور برے، کھرے اور کھوٹے جو کچھ ہیں، وہ عقائد و اعمال کی بنا پر ہیں جو تمام تر اپنے اختیار و ارادہ کی چیزیں ہیں، نہ کہ فلاں خاندان میں، فلاں سرزمین پر، فلاں ملک میں، پیدا ہو جانے کی بنا پر، جو انسان کے اپنے ارادہ و اختیار سے تمام تر باہر ہے؟

اسلام کے قبل دنیا تو مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی ہی، حد یہ ہے کہ دیوتا اور خدا تک ہر ہر شہر اور ضلع کے دوسری جگہ سے الگ تھے یہود جو موحد تھے، ان تک نے باوجود دعوائے توحید کے خدا کی خدائی کو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر لیا تھا، اور رب موسیٰ گویا صرف رب قوم موسیٰ تھا۔ یہ تخیل تو اسلام ہی نے آکر ہٹایا۔ اسلام ہی نے رب العالمین، کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا سب کو وحدت عقیدہ کی طرف بلایا۔ اور دنیا کی تقسیم صرف دو ہی حصوں میں رکھی۔ پیام کو قبول کرنے والے اور نہ قبول کرنے والے۔

خدا کا غضب ہے کہ خود مسلمان ہی اس خدائی تفریق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اور پھر اس کی جگہ وہ مشرک قوموں والی دور جاہلیت والی، ذات پات والی، چھوت چھات والی تقسیم قائم کرنا چاہتے ہیں شاندار ناموں کی آڑ میں بڑے بڑے القاب کو سپر بنا کر، اور یہ بھی اس وقت جب خود یورپ اپنی نکالی ہوئی راہ سے عاجز آچلا ہے اور خود اپنے پیروں سے ان بیڑیوں کو کاٹنا چاہ رہا ہے عملاً اسے اس پر قدرت ہو یا نہ ہو، یہ الگ سوال ہے، باقی اس کے سوچنے والے دماغ سوچ تو اب بھی رہے ہیں۔ (ماخوذ از صدق)

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۱۰)

چہرے کا حکم: سورۂ احزاب کی جس آیت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ	اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی
وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ	عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے
جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ	گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے
فَلَا يُؤْذَيْنَ ۔ (رکوع ۸)۔	کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انہیں ستایا نہ جائے گا۔

یہ آیت خاص چہرے کو چھپانے کے لیے ہے جلابیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی چادر کے ہیں۔ ادنا، کے معنی ارخاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ یُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "اپنے اوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں"۔ یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے۔ مگر اصل مقصد وہ خاص وضع نہیں ہے جس کو عرف عام میں گھونگھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر باہر نکلیں گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں، بے حیا نہیں ہیں۔ اس لیے کوئی ان سے تعرض نہ کرے گا۔

قرآن مجید کے تمام مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت ابن عباس

اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانک لیا کریں"۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۲۲۔ صفحہ ۲۹)۔

امام محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارث الحضرمیؒ سے دریافت کیا کہ اس حکم پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور ناک اور ایک آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی (تفسیر ابن جریر حوالۂ مذکور۔ و احکام القرآن جلد سوم صفحہ ۴۵۷)۔

علامہ ابن جریر طبری اس آیۃ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اے نبی اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ جب اپنے گھروں سے کسی حاجت کے لیے نکلیں تو لونڈیوں کے سے لباس نہ پہنیں کہ سر اور چہرے کھلے ہوئے ہوں بلکہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان سے تعرض نہ کر سکے اور جان لیں کہ وہ شریف عورتیں ہیں" (تفسیر ابن جریر حوالۂ مذکور)

علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں :

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت پردہ داری اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ بدنیت لوگ اس کے حق میں طمع نہ کر سکیں (احکام القرآن جلد سوم صفحہ ۴۵۸)۔

علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں :۔

"ابتدائے عہد اسلام میں عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح محض قمیص اور دوپٹے کے

ساتھ نکلتی تھیں اور شریف عورتوں کا لباس ادنی طبقہ کی عورتوں سے مختلف نہ تھا پھر حکم دیا گیا کہ وہ چادریں اوڑھیں اور اپنے سر اور چہروں کو چھپائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ وہ شریف عورتیں ہیں، فاحشہ نہیں ہیں"۔ (تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ ابن جریر جلد ۲۲ ۔صفحہ ۳۲)۔

امام رازی لکھتے ہیں:۔

"جاہلیت میں اشراف کی عورتیں اور لونڈیاں سب کھلی پھرتی تھیں اور بدکار لوگ ان کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شریف عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اوپر چادریں ڈالیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ تو اس کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اس لباس سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ شریف عورتیں ہیں اور ان کا پیچھا نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہوجائیگا کہ وہ بدکار نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، دراں حالیکہ چہرہ "عورت" نہیں ہے جس کا چھپانا فرض ہو، تو کوئی شخص اس سے یہ توقع نہ کرے گا کہ وہ عورت "کشف عورت" پر آمادہ ہوگی۔ پس اس لباس سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ وہ ایک پردہ دار عورت ہے، اور اس سے بدکاری کی توقع نہ کی جاسکے گی (تفسیر کبیر۔جلد ۲۔صفحہ ۵۹۱)۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

"يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ یعنی جب وہ اپنی حاجات کے لیے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنے چہروں اور اپنے جسموں کو چھپالیں۔ یہاں لفظ من تبعیض کے لیے ہے یعنی چادروں کے ایک حصہ کو منہ پر ڈالا جائے اور ایک حصہ کو جسم پر لپیٹ لیا جائے۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ۔ یعنی اس سے ان

کے اور لونڈیوں اور مغنیات کے درمیان تیز ہو جائے گی فَلَا یُؤْذَیْنَ اور مشتبہ چال چلن کے لوگ ان سے تعرض کی جرأت نہ کر سکیں گے (تفسیر بیضاوی جلد ۴ صفحہ ۱۶۸)

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانہ میں اس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ہے۔ اور وہ وہی مفہوم ہے جو اس کے الفاظ سے ہم نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو وہاں بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سے عہد نبوی میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں، اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہو گیا تھا۔ ابو داؤد، ترمذی، موطا اور دوسری کتب حدیث میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حالت احرام میں چہرے پر نقاب ڈالنے اور دستانے پہننے سے منع فرما دیا تھا (المحرمۃ لا تنتقب ولا تلبس القفازین۔ ونھی النساء فی احرامھن عن القفازین والنقاب) اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں چہروں کو چھپانے کے لیے نقاب اور ہاتھوں کے چھپانے کے لیے دستانوں کا عام رواج ہو چکا تھا۔ صرف احرام کی حالت میں اس سے منع کیا گیا۔ مگر اس سے بھی یہ مقصد نہ تھا کہ حج میں چہرے منظر عام پر پیش کیے جائیں، بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ احرام کی فقیرانہ وضع میں نقاب عورت کے لباس کا ایک جزء نہ ہو، جس طرح عام طور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں تصریح کی گئی ہے کہ حالت احرام میں بھی ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام اپنے چہروں کو اجانب سے چھپاتی تھیں۔ ابو داؤد میں ہے:۔

عن عائشۃ قالت کان الرکبان یمرون بنا ونحن مع رسول اللہ صلعم	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سوار ہمارے قریب سے گذرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

محرمات فاذا حاذا دابنا سدلت احدانا جلبابها من راسها علی وجهها فاذا جاوزونا کشفناہ (باب فی المحرمة تغطی وجهها)۔

کے ساتھ حالت احرام میں تھیں پس جب وہ لوگ ہمارے مقابل آجاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں کی طرف سے اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گذر جاتے تو منہ کھول لیتی تھیں۔

موطأ امام مالک میں ہے :۔

عن فاطمة بنت المنذر قالت کنا نخمر وجوهنا ونحن محرمات ونحن مع اسماء بنت ابی بکر الصدیق فلا تنکرہ علینا (باب تخمیر المحرم وجهه)

فاطمہ بنت منذر کا بیان ہے کہ ہم حالت احرام میں اپنے چہروں پر کپڑا ڈال لیا کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسماء تھیں انہوں نے ہم کو اس سے منع نہیں کیا۔

فتح الباری، کتاب الحج میں حضرت عائشہ کی ایک اور روایت ہے :۔

تسدل المرأة جلبابها من فوق راسها علی وجهها۔

عورت حالت احرام میں اپنی چادر اپنے سر پر سے چہرے پر لٹکائے۔

نقاب — جو شخص آیت قرآنی کے الفاظ، اور اُن کی مقبول عام اور مجمع علیہ تفسیر، اور عہد نبوی صلعم کے تعامل کو دیکھے گا اس کے لیے اس حقیقت سے انکار کی مجال باقی نہ رہے گی کہ شریعت اسلامیہ میں عورت کے لیے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے، اور اس پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے عمل کیا جا رہا ہے۔ نقاب اگر لفظاً نہیں تو معنیً وحقیقةً خود قرآن عظیم کی تجویز کردہ چیز ہے۔ جس ذات مقدس پر قرآن نازل ہوا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے خواتین اسلام نے اس چیز کو اپنے خارج البیت لباس کا جز بنایا تھا، اور اس زمانہ میں بھی اس چیز کا نام "نقاب" ہی تھا۔

جی ہاں! یہ وہی "نقاب" (Veil) ہے جس کو یورپ انتہا درجہ کی مکروہ اور گھناونی چیز سمجھتا ہے، جس کا محض تصور ہی فرنگی ضمیر پر ایک بارگراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں! یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی شرقی قوم کی جہالت اور تمدنی پسماندگی کے ذکر میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے، اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدن و تہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذکر بڑے انشراح و انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس قوم سے "نقاب" رخصت ہو گئی ہے۔ اب شرم سے سر جھکا لیجیے کہ یہ چیز بعد کی ایجاد نہیں، خود قرآن نے اس کو ایجاد کیا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کو رائج کر گئے ہیں۔ مگر محض سر جھکانے سے کام نہ چلے گا۔ شتر مرغ اگر شکاری کو دیکھ کر ریت میں سر چھپا لے تو شکاری کا وجود باطل نہیں ہو جاتا۔ آپ بھی اپنا سر جھکائیں گے، تو سر ضرور جھک جائے گا، مگر قرآن کی آیت نہ مٹے گی، نہ تاریخ کے ثابت شدہ واقعات محو ہو جائیں گے۔ تاویلات سے اس پر پردہ ڈالیے گا تو یہ "شرم کا داغ" اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ جب وحی مغربی پر ایمان لا کر آپ اس کو "شرم کا داغ" مان ہی چکے ہیں، تو اس کو دور کرنے کی اب ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس اسلام ہی سے اپنی براءت کا اعلان فرما دیں جو "نقاب"، "گھونگھٹ"، "ستر" جیسی گھناونی چیز کا حکم دیتا ہے۔ آپ "ترقی" کے خواہش مند ہیں۔ آپ کو "تہذیب" درکار ہے۔ آپ کے لیے ایسا مذہب قابل اتباع نہیں ہو سکتا جو خواتین کو شمع انجمن بننے سے روکتا ہو، حیا اور پردہ داری اور عفت مآبی کی تعلیم دیتا ہو، گھر کی ملکہ کو اہل خانہ کے سوا ہر ایک کے لیے قرۃ العین بننے سے منع کرتا ہو۔ بھلا ایسے مذہب میں "ترقی" کہاں! ایسے مذہب کو "تہذیب" سے کیا واسطہ! "ترقی" اور "تہذیب" کے لیے تو ضروری ہے کہ عورت نہیں، لیڈی صاحبہ باہر نکلنے سے پہلے دو گھنٹے تک تمام مشاغل سے دست کش ہو کر اپنی تزئین و آرائش میں مشغول ہوں، تمام جسم کو معطر کریں، رنگ اور

وضع کی مناسبت سے انتہا درجہ کا جاذب نظر لباس زیب تن فرمائیں۔ مختلف قسم کے غازے اور لب
چہرے اور بانہوں کی تنویر بڑھائیں، ہونٹوں کو لپ سٹک سے مزین کریں، کمان ابرو کو درست
اور آنکھوں کو تیر اندازی کے لیے چست کر لیں، اور ان سب کرشموں سے مسلح ہو کر گھر سے باہر
نکلیں تو شان یہ ہو کہ ہر کرشمہ دامن دل کو کھینچ کھینچ کر "جا این جاست" کی صدا لگا رہا ہو! پھر اس
سے بھی ذوق خود آرائی کی تسکین نہ ہو۔ آئینہ اور سنگھار کا سامان ہر وقت ساتھ رہے۔ تاکہ تھوڑی
تھوڑی دیر بعد اسباب زینت کے خفیف ترین نقصانات کی بھی تلافی کی جاتی رہے۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد میں بعد المشرقین ہے،
اور وہ شخص سخت غلطی کرتا ہے جو مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام کی تعبیر کرتا ہے۔ مغرب میں اشیاء
کی قدر و قیمت کا جو معیار ہے، اسلام کا معیار اس سے بالکل مختلف ہے۔ مغرب جن چیزوں کو
نہایت اہم اور مقصود حیات سمجھتا ہے، اسلام کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں، اور اسلام
جن چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، مغرب کی نگاہ میں وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ اب جو شخص مغربی
معیار کا قائل ہے، اس کو تو اسلام کی ہر چیز قابل ترمیم ہی نظر آئے گی۔ وہ اسلامی احکام کی
تعبیر کرنے بیٹھے گا تو ان کی تحریف کر ڈالے گا۔ اور تحریف کے بعد بھی ان کو اپنی زندگی میں کسی
طرح نصب نہ کر سکے گا، کیونکہ قدم قدم پر قرآن اور سنت کی تصریحات اس کی مزاحمت کریں گی۔
ایسے شخص کو عملی طریقوں کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جن مقاصد کے لیے
ان طریقوں کو اختیار کیا گیا ہے وہ خود کہاں تک قابل قبول ہیں۔ اگر وہ مقاصد ہی سے اتفاق
نہیں رکھتا تو حصول مقاصد کے طریقوں پر بحث کرنے اور ان کو مسخ اور محرّف کرنے کی فضول
زحمت ہی وہ کیوں اٹھائے؟ کیوں نہ اس مذہب کو چھوڑ دے جس کے مقاصد کو وہ غلط سمجھتا ہے؟
اور اگر اسے مقاصد سے اتفاق ہے تو بحث صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ ان مقاصد کے لیے جو

عملی طریقے تجویز کیے گئے ہیں وہ مناسب ہیں یا نامناسب ورنہ اس بحث کو بآسانی طے کیا جاسکتا ہے لیکن یہ طریقہ صرف وہی لوگ اختیار کرسکتے ہیں جو منافق نہیں ہیں کہ ایک چیز پر اعتقاد کا دعویٰ کریں اور درحقیقت اعتقاد دوسری چیز پر رکھیں

نقاب اور ستر وجوہ کے مسئلہ میں جس قدر بحثیں کی جارہی ہیں وہ دراصل اسی نفاق پر مبنی ہیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کیا گیا ہے کہ پردے کی یہ صورت اسلام سے پہلے کی قوموں میں رائج تھی اور جاہلیت کی یہ میراث عہد نبوی کے بہت مدت بعد مسلمانوں میں تقسیم ہوئی۔ قرآن کی ایک صریح آیت اور عہد نبوی کے ثابت شدہ تعامل اور صحابہ و تابعین کی تشریحات کے مقابلہ میں تاریخی تحقیقات کی یہ زحمت کیوں اٹھائی گئی؟ صرف اس لیے کہ زندگی کے وہ مقاصد پیش نظر ہیں جو مغرب سے درآمد ہوتے ہیں۔ "ترقی" اور "تہذیب" کے وہ تصورات ذہن نشین ہوگئے ہیں جو اہل مغرب سے نقل کیے گئے ہیں۔ چونکہ ستر وجوہ ان مقاصد کے خلاف ہے اور ان تصورات سے کسی طرح میل ہی نہیں کھاتا۔ لہٰذا تاریخی تحقیق کے زور سے اس چیز کو مٹانے کی کوشش کی گئی جو اسلام کی کتاب آئین میں ثبت ہے۔ یہ کھلی ہوئی منافقت جو بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی برتی گئی ہے، اس کی اصلی وجہ وہی بے اصولی اور عقل کی خفت اور اخلاقی جرأت کی کمی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتباع اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کے مقابلہ میں تاریخ کو لاکر کھڑا کرنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آتا۔ یا تو وہ اپنے مقاصد کو اسلام کے مقاصد سے بدل ڈالتے (اگر مسلمان رہنا چاہتے) یا علانیہ اس مذہب سے الگ ہوجاتے جو ان کے معیار ترقی کے لحاظ سے مانع ترقی ہے۔

جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقل عام (Common Sense) بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے

حسن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے! ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائشی زینت، یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر وہی ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹولیے اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے۔ اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے خلاف دیکھے گا تو دن دہاڑے کہہ دے گا کہ آفتاب موجود نہیں۔ البتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (Sex appeal) میں جسم کی ساری تزئینات سے زیادہ حصہ اس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اس حقیقت کے مسلم ہو جانے کے بعد آگے بڑھیے۔ اگر سوسائٹی میں صنفی انتشار اور لامرکزی ہیجانات و تحریکات کو روکنا مقصود ہی نہ ہو، تب تو چہرہ کیا معنی، سینہ اور بازو اور پنڈلیاں اور رانیں سب ہی کچھ کھول دینے کی آزادی ہونی چاہیے، جیسی کہ اس وقت مغربی تہذیب میں ہے۔ اس صورت میں ان حدود و قیود کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو اسلامی قانونِ حجاب کے سلسلہ میں آپ اوپر سے دیکھتے چلے آرہے ہیں لیکن اگر اصل مقصد اسی طوفان کو روکنا ہو تو اس سے زیادہ خلافِ حکمت اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو اسلام نے حاجات و ضروریات کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

اسلام کا قانون کوئی غیر متوازن اور یک رُخا قانون نہیں ہے وہ ایک طرف مصالح اخلاقی کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ضروریات کا بھی لحاظ کرتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے وہ اخلاقی فتنوں کا سدباب بھی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنا نہیں چاہتا جن کے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں کیونکہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائماً چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آسکتی ہے پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں؛ اور اس قاعدہ میں الا ما ظھر منھا کے استثناء سے یہ آسانی پیدا کردی گئی کہ حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس کو کھول سکتی ہیں، بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو بلکہ رفع ضرورت مدِّنظر ہو! پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سدباب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غضّ بصر کا حکم دے دیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیں، اور بیہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں۔ پردہ داری کے ان احکام پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اسلامی پردہ کوئی جاہلی رسم نہیں ہے، بلکہ ایک عقلی قانون ہے۔ جاہلی رسم ایک جامد چیز ہوتی ہے۔ جو طریقہ جس صورت سے رائج ہوگیا، کسی حال میں اس کے اندر تغیر نہیں کیا جاسکتا جو چیز چھپادی گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے چھپادی گئی اب مرتے مرجائیں مگر اس کا کھلنا غیر ممکن بخلاف اس کے عقلی قانون میں لچک ہوتی ہے۔ اس میں احوال کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی گنجائش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کے

عام قواعد میں استثنائی صورتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسے قانون کی پیروی اندھوں کی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے عقل اور تمیز کی ضرورت ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والا متبع خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ کہاں اس کو عام قاعدے کی پیروی کرنی چاہیے، اور کہاں قانون کے نقطۂ نظر سے حقیقی ضرورت درپیش ہے جس میں استثنائی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پھر وہ خود ہی یہ رائے بھی قائم کرسکتا ہے کہ کس محل پر رخصت سے کس حد تک استفادہ کیا جائے، اور استفادہ کی صورت میں مقصد قانون کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے۔ ان تمام امور میں درحقیقت ایک نیک نیت مومن کا قلب ہی سچا مفتی بن سکتا ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ استفت قلبك اور دع ما حاك فی صدرك (اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو۔ اور جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو) یہی وجہ ہے کہ اسلام کی صحیح پیروی جہالت اور ناسمجھی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ یہ عقلی قانون ہے اور اس کی پیروی کے لیے قدم قدم پر تفقّہ اور تدبّر کی ضرورت ہے۔

باہر نکلنے کے قوانین لباس اور ستر کے حدود مقرر کرنے کے بعد آخری حکم جو عورتوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْأُولَىٰ۔ (الاحزاب: ۴)

وَلَا یَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِینَ مِن زِینَتِهِنَّ (النور: ۴)

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِی فِی قَلْبِهِ مَرَضٌ (الاحزاب: ۴)۔

وقرن کی قراءت میں اختلاف ہے۔ عام قرّاء مدینہ اور بعض کوفیوں نے اس کو وَقَرْنَ بفتح قاف پڑھا ہے جس کا مصدر قرار ہے۔ اس لحاظ سے ترجمہ یہ ہوگا کہ "اپنے گھروں میں ٹھیری رہو یا جمی بیٹھی رہو۔ عام قرّاء کوفہ و بصرہ نے وَقِرْنَ بکسر قاف پڑھا ہے جس کا مصدر وقار ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے گھروں میں وقار اور سکینت کے ساتھ رہو۔

تبرج کے دو معنی ہیں۔ ایک زینت اور محاسن کا اظہار۔ دوسرے چلنے میں ناز و انداز دکھانا، تبختر کرتے ہوئے چلنا، اٹھلانا، لچکے کھانا، جسم کو توڑنا، ایسی چال اختیار کرنا جس میں ایک ادا پائی جاتی ہو۔ آیت میں یہ دونوں معنی مراد ہیں۔ جاہلیت اولیٰ میں عورتیں خوب بن سنور کر نکلتی تھیں جس طرح دور جدید کی جاہلیت میں نکل رہی ہیں۔ پھر چال بھی قصداً ایسی اختیار کی جاتی تھی کہ ہر قدم زمین پر نہیں بلکہ دیکھنے والوں کے دلوں پر پڑے۔ مشہور تابعی و مفسر قرآن قتادہ بن دعامہ کہتے ہیں کہ کانت لھن مشیۃ وتکسر و تغنج فنھاھن اللّٰہ عن ذالک۔ اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے کسی تاریخی بیان کی حاجت نہیں کسی ایسی سوسائٹی میں تشریف لے جائیے جہاں مغربی وضع کی خواتین تشریف لاتی ہوں۔ جاہلیت اولیٰ کی تبرج والی چال آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اسلام اسی سے منع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اول تو تمہاری صحیح جائے قیام تمہارا گھر ہے۔ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں سے تم کو اسی لیے سبکدوش کیا گیا ہے کہ تم سکون و وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں رہو اور خانگی زندگی کے فرائض ادا کرو۔ تاہم اگر ضرورت پیش آئے تو گھر سے باہر نکلنا بھی تمہارے لیے جائز ہے، لیکن نکلتے وقت پوری عصمت تابی ملحوظ رکھو۔ نہ تمہارے لباس میں کوئی شان اور بھڑک ہونی چاہیے کہ نظروں کو تمہاری طرف مائل کرے۔ نہ اظہار حسن کے لیے تم میں کوئی بے تابی ہونی چاہیے کہ چلتے چلتے کبھی چہرے کی جھلک دکھاؤ اور کبھی ہاتھوں کی نمائش کرو۔ نہ چال میں کوئی خاص ادا پیدا کرنی چاہیے کہ نگاہوں کو خود بخود تمہاری طرف متوجہ کر دے۔ ایسے زیور بھی پہن کر نہ نکلو جن کی جھنکار غیروں کے لیے سامعہ نواز ہو۔ قصداً لوگوں کو سنانے کے لیے آواز بھی نہ نکالو۔ ہاں اگر بولنے کی ضرورت پیش آئے تو بولو۔ مگر آواز میں رس بھرنے کی کوشش نہ کرو۔ ان قواعد اور حدود کو ملحوظ رکھ کر اپنی حاجات کے لیے تم گھر سے باہر نکل سکتی ہو۔

ہے قرآن کی تعلیم۔ آئیے اب حدیث پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اس تعلیم کے مطابق سوسائٹی میں عورتوں کے لیے کیا طریقے مقرر فرمائے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور انکی خواتین نے اس پر کس طرح عمل کیا۔

حاجات کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت

حدیث میں ہے کہ احکام حجاب نازل ہونے سے پہلے حضرت عمر کا تقاضا تھا کہ یا رسول اللہ اپنی خواتین کو پردہ کرائیے۔ ایک مرتبہ امّ المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رات کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمر نے ان کو دیکھ لیا اور پکار کر کہا کہ سودہ! ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح خواتین کا گھروں سے نکلنا ممنوع ہو جائے۔ اس کے بعد جب احکام حجاب نازل ہوئے تو حضرت عمر کی بن آئی۔ انہوں نے عورتوں کے خروج پر زیادہ روک ٹوک شروع کردی۔ ایک مرتبہ پھر حضرت سودہ کے ساتھ وہی صورت پیش آئی۔ وہ گھر سے نکلیں اور عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا۔ انہوں نے آں حضرت سے شکایت کی۔ حضور نے فرمایا قد اذن اللہ لکنّ ان تخرجن لحوائجکن (اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے)[1]

اس سے معلوم ہوا کہ وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ کے حکم قرآنی کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے کبھی قدم باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات و ضروریات کے لیے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔ عورتیں اس کی مجاز نہیں ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مل جائیں۔ حاجات و ضروریات سے شریعت کی مراد ایسی واقعی حاجات و ضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کام کرنا عورتوں کے لیے

---

[1] یہ متعدد احادیث کا لب لباب ہے۔ ملاحظہ ہو مسلم۔ باب اباحۃ الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان۔ بخاری۔ باب خروج النساء لحوائجھن و باب آیۃ الحجاب۔

ناگزیر ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لیے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر ہر موقع کے لیے رخصت کے علیحدہ علیحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شارع نے زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لیے خروج کے جو قاعدے مقرر کیے تھے اور حجاب کے حدود میں جس طرح کمی و بیشی کی تھی اس سے قانون اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور اس کو سمجھ کر انفرادی حالات اور جزئی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقع و محل کے لحاظ سے ان کی کمی و بیشی کے اصول ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے ہم مثال کے طور پر چند مسائل بیان کرتے ہیں۔

مسجد میں آنے کی اجازت اور اس کے حدود

یہ معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے اہم فرض نماز ہے، اور نماز میں حضورِ مسجد اور شرکتِ جماعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر نماز باجماعت کے باب میں جو احکام مردوں کے لیے ہیں ان کے بالکل برعکس احکام عورتوں کے لیے ہیں۔ مردوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو مسجد میں جماعت کے ساتھ ہو، اور عورتوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو گھر میں انتہائی خلوت کی حالت میں ہو۔ امام احمد اور طبرانی نے اُمّ حُمَید ساعدیہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ :۔

قالت یا رسول اللہ انی احب الصلوٰۃ معك قال قد علمت۔ وصلوٰتكِ فی بیتك خیر لك من صلوٰتك فی حجرتك وصلوٰتك فی حجرتكِ خیر من صلوٰتكِ فی دارك وصلوٰتك فی دارك خیر من صلوٰتكِ فی مسجد قومك وصلوٰتكِ فی مسجد	انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ حضور نے فرمایا مجھے معلوم ہے مگر تیرا ایک گوشہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے کمرے میں نماز پڑھے۔ اور کمرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے گھر کے دالان میں نماز پڑھے اور تیرا اپنے دالان میں نماز

قومك خير من صلوٰتك في مسجد الجماعة ۔

اور تیرا اپنے دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھے۔ اور تیرا اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ مسجد جامع میں نماز پڑھے[۱]

اسی مضمون کی حدیث ابو داؤد میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ

صلوٰة المرأة في بيتها افضل من صلوٰتها في حجرتها وصلوٰتها في مخدعها افضل من صلوٰتها في بيتها (باب ماجاء في خروج النساء الی المساجد)

عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے چور خانہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھے۔

دیکھیے یہاں ترتیب بالکل الٹ گئی ہے۔ مرد کے لیے سب سے ادنیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ وہ ایک گوشۂ تنہائی میں پڑھے، اور سب سے افضل یہ کہ وہ بڑی سے بڑی جماعت میں شریک ہو۔ مگر عورت کے لیے اس کے برعکس انتہائی خلوت کی نماز میں فضیلت ہے، اور اس کو نہ صرف نماز باجماعت پر ترجیح دی گئی ہے، بلکہ اس نماز سے بھی افضل کہا گیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت

[۱] عورت کو اس قدر خلوت میں نماز پڑھنے کی ہدایت جس مصلحت سے دی گئی ہے اس کو خود عورتیں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مہینے میں چند روز ایسے آتے ہیں جن میں عورت کو مجبوراً نماز ترک کرنی پڑتی ہے اور اس طرح وہ بات ظاہر ہو جاتی ہے جسے کوئی حیادار عورت اپنے بھائی بہنوں پر بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہت سی عورتیں اسی شرم کی وجہ سے تارک صلوٰۃ ہو جاتی ہیں۔ شارع نے اس بات کو محسوس کرکے ہدایت فرمائی کہ چھپ کر خلوت کے ایک گوشہ میں نماز پڑھا کرو، تاکہ کسی کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ تم کب نماز پڑھتی ہو اور کب چھوڑ دیتی ہو۔ مگر یہ صرف ہدایت ہے تاکید اور حکم نہیں ہے۔ عورتیں گھر میں اپنی الگ جماعت کر سکتی ہیں اور عورت ان کی امامت کر سکتی ہے۔ اُمِ وَرَقہ بنت نوفل کو آنحضرتؐ نے اجازت دی تھی کہ عورتوں کی امامت کریں (ابو داؤد) دارقطنی اور بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عورتوں کی امامت کی اور صف کے بیچ میں کھڑی ہو کر نماز پڑھائی۔

مسلمان کے لیے ہو ہی نہیں سکتی تھی یعنی مسجد نبوی کی جماعت جس کے امام خود امام الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آخر اس فرق و امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ شارع نے عورت کے باہر نکلنے کو پسند نہیں کیا، اور جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کو روکنا چاہا۔

مگر نماز ایک مقدس عبادت ہے اور مسجد ایک پاک مقام ہے۔ شارع حکیم نے اختلاط صنفین کو روکنے کے لیے اپنے منشا کا اظہار توضیلت اور عدم فضیلت کی تفریق سے کر دیا۔ مگر ایسے کام کے لیے ایسی جگہ آنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا۔ حدیث میں یہ اجازت جن الفاظ کے ساتھ ہے وہ شارع کی بے نظیر حکیمانہ شان پر دلالت کرتے ہیں۔ فرمایا۔

لاتمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ اذا استاذنت امرأۃ احدکم الی المسجد فلا یمنعھا۔ (بخاری و مسلم)

خدا کی لونڈیوں کو خدا کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔ جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اس کو منع نہ کرے۔

لاتمنعوا النساءکم المساجد وبیوتھن خیرلھن۔ (ابو داؤد)

اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو مگر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔

یہ الفاظ خود ظاہر کر رہے ہیں کہ شارع عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتا تو نہیں ہے، کیونکہ مسجد میں نماز کے لیے جانا کوئی برا فعل نہیں جس کو ناجائز قرار دیا جا سکے۔ مگر مصالح اس کی بھی مقتضی نہیں کہ مساجد میں ذکور و اناث کی جماعت مخلوط ہو جائے۔ لہٰذا ان کو آنے کی اجازت تو دے دی مگر یہ نہیں فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجدوں میں بھیجو، یا اپنے ساتھ لایا کرو۔ بلکہ صرف یہ کہا کہ اگر وہ افضل نماز کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا چاہیں اور اجازت مانگیں تو منع نہ کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو روح اسلام کے بڑے رازداں تھے، شارع کی اس حکمت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مؤطا میں مذکور ہے کہ ان کی بیوی عاتکہ بنت زید سے ہمیشہ اس معاملہ میں انکی کشمکش

رہا کرتی تھی۔ حضرت عمر نہ چاہتے تھے کہ وہ مسجد میں جائیں۔ مگر انھیں جانے پر اصرار تھا، وہ اجازت مانگتیں تو آپ ٹھیک ٹھیک حکم نبوی پر عمل کرکے بس خاموش ہوجاتے مطلب یہ تھا کہ ہم تمہیں روکتے نہیں ہیں، مگر صاف صاف اجازت بھی نہ دیں گے۔ وہ بھی اپنی بات کی پکی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ خدا کی قسم میں جاتی رہونگی جب تک کہ آپ صاف الفاظ میں منع نہ کریں گے۔[له]

مسجد میں آنے کی شرائط حضورِ مساجد کی اجازت دینے کے ساتھ چند شرائط بھی مقرر کردی گئیں ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ دن کے اوقات میں مسجد میں نہ جائیں بلکہ صرف ان نمازوں میں شریک ہوں جو اندھیرے میں پڑھی جاتی ہیں، یعنی عشا اور فجر۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلعم ائذنوا للنساء باللیل الی المساجد۔	ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو

ترمذی باب خروج النساء الی المسجد۔

وَفِی ھٰذا المعنیٰ حدیث اخرجہ البخاری فی باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس۔ وقال نافع مولیٰ ابن عمر وکان اختصاص اللیل بذالک لکونہ استر و اخفیٰ۔	حضرت ابن عمر کے شاگرد خاص حضرت نافع کہتے ہیں کہ رات کی تخصیص اس لیے کی کہ رات کی تاریکی میں اچھی طرح پردہ داری ہوسکتی ہے۔
عن عائشۃ قالت کان رسول اللّٰہ صلعم یصلی الصبح فینصرف النساء متلفعات	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ جب عورتیں نماز کے

له یہ حال صرف حضرت عمر ہی کی بیوی کا نہ تھا بلکہ عہد نبوی میں بکثرت عورتیں نماز با جماعت کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں ابوداؤد میں ہے کہ مسجد نبوی میں بسا اوقات عورتوں کی دو دو صفیں ہوجاتی تھیں (باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اہلہ)

یبرو طھن مایعرفن من الغلس[1] بعد اپنی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوی گذرتیں تو تاریکی کی وجہ سے پہچانی نہ جاتیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مسجد میں زینت کے ساتھ نہ آئیں، نہ خوشبو لگا کر آئیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور مسجد میں تشریف فرما تھے کہ قبیلۂ مُزَینَہ کی ایک عورت بہت بنی سنوری ہوئی بڑے ناز و تبختر کے ساتھ چلتی ہوئی آئی۔ حضور نے فرمایا لوگو اپنی عورتوں کو زینت اور تبختر کے ساتھ مسجد میں آنے سے روکو[2]۔ خوشبو کے متعلق فرمایا کہ جس رات تم کو نماز میں شریک ہونا ہو اس رات کو کسی قسم کا عطر لگا کر نہ آؤ، نہ بخور استعمال کرو۔ بالکل سادہ لباس میں آؤ۔ جو عورت خوشبو لگا کر آئیگی اس کی نماز نہ ہوگی[3]۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عورتیں جماعت میں مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں اور نہ آگے کی صفوں میں آئیں۔ بلکہ انھیں مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ خیر صفوف الرجال اولھا وشرھا اٰخرھا وخیر صفوف النساء اٰخرھا و شرھا اولھا۔ "مردوں کے لیے بہترین مقام آگے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام پیچھے کی صفوں میں، اور عورتوں کے لیے بہترین مقام پیچھے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام آگے کی صفوں میں" جماعت کے باب میں حضور نے یہ قاعدہ ہی مقرر کر دیا تھا کہ عورت اور مرد پاس پاس کھڑے ہوں

---

[1] ترمذی باب التغلیس فی الفجر۔ اسی مضمون کی احادیث بخاری (باب وقت الفجر) مسلم (باب استحباب التکبیر بالصبح فی اول وقتھا) ابوداؤد (باب وقت الصبح) اور دوسری مستندات میں مروی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کتب حدیث میں موجود ہے کہ نماز پڑھانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مرد نمازی بیٹھے رہتے تھے تاکہ عورتیں اٹھکر چلی جائیں۔ اس کے بعد آپ اور سب لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو بخاری باب صلوٰۃ النساء خلف الرجال۔ داؤد باب انصراف النساء قبل الرجال عن الصلوٰۃ۔

[2] ابن ماجہ باب فتنۃ النساء

[3] ملاحظہ ہو موطا، باب خروج النساء الی المساجد۔ مسلم باب خروج النساء الی المسجد ابن ماجہ باب فتنۃ النساء

نماز نہ پڑھیں خواہ وہ شوہر اور بیوی یا ماں اور بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میری نانی مُلیکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد آپ نماز کے لیے اٹھے میں اور یتیم (غالباً یہ حضرت انس کے بھائی کا نام تھا) حضور کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ملیکہ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[1]۔ حضرت انس کی دوسری روایت ہے کہ ہمارے گھر میں حضور نے نماز پڑھی میں اور یتیم آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور میری ماں ام سُلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[2]۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نماز کے لیے اٹھے۔ میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہوا اور حضرت عائشہ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[3]۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ عورتیں نماز میں آواز بلند نہ کریں۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر نماز میں امام کو کسی چیز پر تنبیہ کرنا ہو تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں دستک دیں[4]۔

ان تمام حدود و قیود کے باوجود جب حضرت عمر کو جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ ہوا تو آپ نے مسجد میں عورتوں کے لیے ایک دروازہ مختص فرما دیا اور مردوں کو اس دروازہ سے آنے جانے کی ممانعت کر دی[5]۔

حج میں عورتوں کا طریقہ | اسلام کا دوسرا فرض حج ہے۔ اس میں عورتوں کو جانے کی پوری اجازت ہے مگر حتی الامکان مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے بخاری میں عطاء سے روایت ہے کہ عہد نبوی میں عورتیں مردوں کے ساتھ طواف کرتی تھیں مگر خلط ملط نہ ہوتی تھیں[6]۔ فتح الباری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ حضرت

---

[1] ترمذی۔ باب ما جاء فی الرجل یصلی ومعہ رجال ونساء۔
[2] بخاری۔ باب المرأۃ وحدھا تکون صفاً۔
[3] نسائی۔ باب موقف الامام اذا کان معہ صبی وامرأۃ۔
[4] بخاری باب التصفیق للنساء۔ وابوداؤد باب التصفیق فی الصلوٰۃ۔
[5] ابوداؤد۔ باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔
[6] باب طواف النساء مع الرجال۔

عمرؓ نے طواف میں عورتوں اور مردوں کو گڈمڈ ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرد کو آپ نے عورتوں کے مجمع میں دیکھا تو پکڑ کر کوڑے لگائے[1]۔ موطا میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر اپنے بال بچوں کو مزدلفہ سے منیٰ آگے روانہ کر دیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز اور رمی سے فارغ ہو جائیں۔ نیز حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ صبح اندھیرے منہ منیٰ تشریف لے جاتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتوں کے لیے یہی دستور تھا[2]۔

جمعہ و عیدین میں عورتوں کی شرکت جمعہ اور عیدین کے اجتماعات اسلام میں جیسی اہمیت رکھتے ہیں محتاج بیان نہیں۔ ان کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر شارع نے خاص طور پر ان اجتماعات کے لیے وہ شرط اُڑا دی جو عام نمازوں کے لیے تھی یعنی یہ کہ دن میں شریک جماعت نہ ہوں۔ اگرچہ جمعہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ عورتیں فرضیت جمعہ سے مستثنیٰ ہیں (ابو داؤد، باب الجمعۃ للمملوک)۔ اور عیدین میں بھی عورتوں کی شرکت ضروری نہیں لیکن اگر وہ چاہیں تو نماز باجماعت کی دوسری شرائط کے مطابق ان جماعتوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی خواتین کو عیدین میں لیجاتے تھے۔

عن ام عطية قالت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يخرج الابكار والعواتق وذوات الخدور والحيض في العيدين فاما الحيض فيعتزلن المصلى ويشهدن دعوة المسلمين۔ (ترمذی باب خروج النساء في العيدين)

ام عطیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنواری اور جوان لڑکیوں اور گھر گرہستنوں اور ایام والی عورتوں کو عیدین میں لے جاتے تھے جو عورتیں نماز کے قابل نہ ہوتیں، وہ جماعت سے الگ رہتیں اور دعا میں شریک ہو جاتی تھیں۔

---

[1] جلد سوم صفحہ ۳۱۲۔
[2] موطا، ابواب الحج۔ باب تقدیم النساء والصبیان۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج بناتہ ونساءہٗ فی العیدین۔ (ابن ماجہ باب ما جاء فی خروج النساء فی العیدین)

ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

زیارت قبور و شرکت جنازات مسلمان کے جنازے میں شریک ہونا شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق جو تاکیدی احکام ہیں، واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں۔ مگر یہ سب مردوں کے لیے ہیں۔ عورتوں کو شرکت جنازات سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس ممانعت میں سختی نہیں ہے، اور کبھی کبھی اجازت بھی دی گئی ہے، لیکن شارع کے ارشادات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا جنازوں میں جانا کراہت سے خالی نہیں۔ بخاری میں ام عطیہؓ کی حدیث ہے کہ نُھِینَا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا۔ "ہم کو جنازوں کی مشایعت سے منع کیا گیا تھا مگر سختی کے ساتھ نہیں" (باب اتباع النساء الجنازۃ) ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے۔ ایک عورت نظر آئی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ڈانٹا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ یا عمر دعھا (اے عمر اسے چھوڑ دے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت میت کی کوئی عزیز قریب ہوگی۔ شدتِ غم سے مجبور ہو کر ساتھ چلی آئی ہوگی۔ حضورؐ نے اس کے جذبات کی رعایت کر کے حضرت عمرؓ کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع فرما دیا۔

ایسی ہی صورت زیارت قبور کی بھی ہے۔ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں۔ اپنے مردہ عزیزوں کی یاد ان کے دلوں میں زیادہ گہری ہوتی ہے۔ ان کے جذبات کو بالکل پامال کر دینا شارع نے پسند نہ فرمایا مگر یہ صاف کہہ دیا کہ کثرت سے قبروں پر جانا ممنوع ہے۔ ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ لعن رسول اللہ صلعم زوارات القبور۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت قبروں پر جانے والیوں کو ملعون ٹھیرایا تھا (باب ماجاء فی کراھیۃ زیارۃ القبور للنساء[1]) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کی قبر پر تشریف لے گئیں تو فرمایا واللہ لو شھدتک ما زرتک۔ بخدا اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو اب تمہاری قبر کی زیارت کو نہ آتی۔[1] انس بن مالک کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو ایک قبر کے پاس بیٹھے روتے دیکھا تو اسے منع نہ فرمایا بلکہ صرف اتقی اللہ واصبری فرما دیا۔[2]

ان احکام پر غور کیجیے نماز ایک مقدس عبادت ہے مسجد ایک پاک مقام ہے۔ حج میں انسان انتہائی پاکیزہ خیالات کے ساتھ خدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ جنازوں اور قبروں کی حاضری میں ہر شخص کے سامنے موت کا تصور رہتا ہے، غم و الم کے بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سب مواقع ایسے ہیں جن میں صنفی جذبات یا تو بالکل مفقود ہوتے ہیں یا رہتے بھی ہیں تو دوسرے پاکیزہ تر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایسے اجتماعات میں بھی مردوں اور عورتوں کی سوسائٹی کا مخلوط ہونا پسند نہ کیا۔ مواقع کی پاکیزگی، مقاصد کی طہارت اور عورتوں کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھ کر انھیں گھر سے نکلنے کی اجازت تو دی دے دی، بعض مواقع پر خود بھی ساتھ لے گئے، لیکن حجاب کی اتنی قیود لگا دیں کہ فتنے کے ادنیٰ احتمالات بھی باقی نہ رہیں پھر حج کے سوا تمام دوسرے امور کے متعلق فرما دیا کہ ان میں عورتوں کا شریک نہ ہونا زیادہ بہتر ہے۔ جس قانون کا یہ رجحان ہو اس سے آپ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ مدرسوں اور کالجوں میں، دفتروں اور کارگاہوں میں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں اختلاط صنفین کو

---

[1] ابن ماجہ میں یہی مضمون حضرت ابن عباس اور حسان بن ثابت سے بھی منقول ہے۔

[1] ترمذی باب ماجاء فی زیارۃ القبور للنساء۔ [2] بخاری باب زیارۃ القبور۔

جائز رکھے گا؟

جنگ میں عورتوں کی شرکت۔ حدود حجاب کی سختی آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھیے کہ ان میں نرمی کہاں اور کس ضرورت سے کی گئی ہے۔

مسلمان جنگ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عام مصیبت کا وقت ہے۔ حالات مطالبہ کر رہے ہیں کہ قوم کی پوری اجتماعی قوت، دفاع میں صرف کر دی جائے۔ ایسی حالت میں اسلام قوم کی خواتین کو عام اجازت دیتا ہے کہ وہ جنگی خدمات میں حصہ لیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر ہے کہ جو ماں بننے کے لیے بنائی گئی ہے وہ سر کاٹنے اور خون بہانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیر و خنجر دینا اس کی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ اس لیے وہ عورتوں کو جان اور آبرو کی حفاظت کے لیے تو ہتھیار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر بالعموم عورتوں سے مصافی خدمات لینا اور انہیں فوجوں میں بھرتی کرنا اس کی پالیسی سے خارج ہے۔ وہ جنگ میں ان سے صرف یہ خدمت لیتا ہے کہ زخموں کی مرہم پٹی کریں، پیاسوں کو پانی پلائیں سپاہیوں کے لیے کھانا پکائیں اور مجاہدین کے پیچھے کیمپ کی حفاظت کریں ان کاموں کے لیے پردے کی حدود انتہائی حد تک کم کر دی گئی ہیں بلکہ ان خدمات کے لیے تھوڑی ترمیم کے ساتھ وہی لباس پہننا شرعاً جائز ہے جو آج کل ہسپتالوں کی نرسیں پہنتی ہیں۔

تمام احادیث سے ثابت ہے کہ جنگ میں ازواج مطہرات اور خواتین اسلام آنحضرت کے ساتھ جاتیں اور مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ یہ طریقہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد بھی جاری رہا[1]۔ ترمذی میں ہے کہ ام سُلیم اور انصار کی چند دوسری خواتین اکثر لڑائیوں میں حضور کے ساتھ گئی ہیں[2]۔ بخاری میں ہے کہ ایک عورت نے

[1] بخاری باب حمل الرجل امرأتہ فی الغزو۔ [2] ترمذی باب ما جاء فی خروج النساء فی الغزو

حضور سے عرض کیا میرے لیے دعا فرمایئے کہ میں بھی بحری جنگ میں جانے والوں کے ساتھ رہوں[1]
آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اجعلھا منھم۔ جنگ احد کے موقع پر جب مجاہدین اسلام کے پاؤں
اکھڑ گئے تھے حضرت عائشہ اور ام سُلیم اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور
لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں حضرت انس کہتے ہیں کہ اس حال میں میں نے اُن کو پائنچے اٹھائے
دوڑ دوڑ کر آتے جاتے دیکھا۔ ان کی پنڈلیوں کا نچلا حصہ کھلا ہوا تھا[2]۔ ایک دوسری
خاتون ام سلیط کے متعلق حضرت عمر نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کیا ہے
کہ "جنگ اُحد میں دائیں اور بائیں جدھر میں دیکھتا تھا ام سلیط میری حفاظت کے لیے جان
لڑاتی ہوئی نظر آتی تھی"۔ اسی جنگ میں رُبیع بنت معوّذ اور ان کے ساتھ خواتین کی ایک
جماعت زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھی اور یہی عورتیں مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینہ لے جاری
تھیں[3]۔ جنگ حنین میں ام سُلیم ایک خنجر ہاتھ میں لیے پھر رہی تھیں۔ حضور نے پوچھا یہ کس لیے ہے[4]
کہنے لگیں کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی[5]۔ ام عُطیہ سات
لڑائیوں میں شریک ہوئیں کیمپ کی حفاظت، سپاہیوں کے لیے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں[6]
کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ جو خواتین اس قسم کی
جنگی خدمات انجام دیتی تھیں ان کو اموال غنیمت میں سے انعام دیا جاتا تھا[7]۔

---

[1] بخاری باب غزو المرأۃ البحر۔
[2] بخاری باب غزو النساء وقتالھن مع الرجال۔ مسلم باب النساء الغازیات یرضخ لھن۔
[3] بخاری باب مداواۃ النساء الجرحٰی فی الغزو۔
[4] مسلم باب غزوۃ النساء مع الرجال۔
[5] ابن ماجہ۔ باب العبید والنساء یشھدون مع المسلمین۔
[6] مسلم، باب النساء الغازیات یرضخ لھن۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی پردہ کی نوعیت کسی جاہلی رسم کی سی نہیں ہے جس میں مصالح اور ضروریات کے لحاظ سے کمی و بیشی نہ ہو سکتی ہو۔ جہاں حقیقی ضروریات پیش آجاتی ہیں وہاں اس کے حدود کم بھی ہو سکتے ہیں، نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے جا سکتے ہیں، بلکہ جن اعضاء کو ستر عورت میں داخل کیا گیا ہے ان کے بھی بعض حصے اگر حسب ضرورت کھل جائیں تو مضائقہ نہیں لیکن جب ضرورت رفع ہو جائے تو حجاب کو پھر انہی حدود پر قائم ہونا چاہیے جو عام حالات کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جس طرح یہ پردہ جاہلی پردہ نہیں ہے، اسی طرح اس کی تخفیف بھی جاہلی آزادی کے مانند نہیں۔ مسلمان عورت کا حال یورپین عورت کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ ضروریات جنگ کے لیے اپنی حدود سے باہر نکلی تو اس نے جنگ ختم ہونے کے بعد اپنی حدود میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔ (باقی)

مرآۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطلب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عـہ سکہ انگریزی للعہ سکہ حالی

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

خط بنام ایڈیٹر ترجمان القرآن

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ایک خط کے سلسلہ میں

جناب محترم - السلام علیکم -

ترجمان القرآن ماہ جمادی الاخری ۱۳۵۵ھ میں آپ کا مضمون بعنوان "سلسلہ فتنہ تکفیر" کے مطالعہ سے مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ حیرت تو اس وجہ سے ہے کہ آپ جیسے سنجیدہ اور زمانہ شناس انسان نے بھی کیونکر بغیر سوچے سمجھے اپنا زورِ قلم اور دماغ ایک ایسے مضمون پر صرف کیا جس سے نہ صرف آپکی معلومات اور تحقیقات کا پتہ نہ رہتا ہے بلکہ آپکی علمیت کی سنجیدگی اور زبان موعظت کو بھی نقصان پہنچ جاتا ہے اور افسوس اس کا ہے کہ آپنے جن محترم حضرات کے لیے اس قدر درشت اور سخت لہجہ کو استعمال فرمایا ہے وہ آپ کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ اسلامی ہند کی مایہ ناز ہستیاں ہیں جس مصلحتِ سیاسی کے مدِ نظر آپ نے ایک متبحر اور محتاط ہستی کو درسِ احتیاط دیا ہے خود آپ اس سے بہت دور نظر آتے ہیں بلکہ مضمون کے دیکھنے کے بعد صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا نے نہیں بلکہ آپ نے وہ لغزشیں کی ہیں جن کو آپ نے مولانا شبیر احمد صاحب کی طرف منسوب فرمایا ہے

آپ کے پورے مضمون کا صرف اس قدر خلاصہ ہو سکتا ہے کہ زمانہ موجودہ میں مسلمانوں کو آپس میں کفر کا فتوی دینے سے نہ صرف احتیاط بلکہ اجتناب کرنا چاہیے اور محض اپنے اس خیال کو مصلحت سیاسی قرار دیکر آپ نے نہ صرف مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بلکہ اپنے استاد کی بھی جا و بے جا خبر لے ڈالی ہے۔

بہر حال ہمیں اس سے تو بحث نہیں کہ آپ نے شخصی طور پر کن حضرات کو مخاطب فرمایا ہے

ہم تو اس وقت صرف آپ کے اس اصول پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جس پر آپ نے اپنے مضمون میں بہت محنت اور کاوش کے ساتھ لفظی استدلال سے عبارتوں کی الجھنوں میں پھنسا کر عوام میں غلط فہمی پھیلانے کی ان تھک کوشش کی ہے۔

ف۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرنی چاہیے

جناب من! یہ ایک مذہبی فریضہ اور ذمہ دارانہ خدمت ہے آپ کے فرمانے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف آج کل ہی احتیاط کی ضرورت ہے اور اس سے پہلے نہ اسلاف نے احتیاط سے کام لیا اور نہ آیندہ ضرورت ہو گی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کس طرح آپ نے اس قدر غیر ذمہ دارانہ تحریر پیش کر کے دنیا کے سامنے علوم اسلامیہ اور فن افتاء کا مذاق بنایا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ائمہ کرام نے سختیاں برداشت کرنا قید میں جانا اور سزائیں بھگتنا سب کچھ گوارا فرمایا لیکن کبھی کسی مصلحت کی بنا پر فتویٰ دینے سے اجتناب اور فتویٰ دینے میں سیاسی احتیاط نہیں برتی پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا زمانہ سازی کے لحاظ سے مولٰنا کو نصیحت فرمانا کہ "وہ فتویٰ لکھنے سے انکار فرما دیتے" کہاں تک حق بجانب ہے۔ کیا حقیقتاً ایک مفتی اور عالم کے لیے یہ جائز ہے کہ جب جی چاہے فتوی دے اور جب جی چاہے انکار کر دے؟ کیا حضرت امام احمد ابن حنبل رح بھی آپ کے اس اصول پر (اگر یہ صحیح ہوتا) عمل فرما کر تکلیفوں سے نجات نہیں پا سکتے تھے اور مصلحت و احتیاط سے کام لے کر عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے تھے اور اگر آپ کا یہ اصول صحیح نہیں تو پھر آپ کس بنا پر مولٰنا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ فتویٰ دینے سے انکار کر دیتے اور مصلحت و احتیاط کو کام میں لا کر اظہار حق سے باز رہتے۔

ف بات صرف اس قدر ہے کہ مولٰنا شبیر احمد صاحب و دیگر حضرات کے سامنے ایک عبارت یا قول بغیر کسی حوالہ اور نام کے پیش کیا گیا اور اس پر فتوی طلب کیا گیا۔ مولٰنا نے شریعت کی

رو سے فتوی بھی دیدیا نفس فتوی سے تو آپ کو نہ بحث ہے اور نہ اختلاف اور نہ آپ میں یہ قوت ہے کہ آپ ثابت کر سکیں کہ جس عبارت پر جن الفاظ میں مولٰنا نے فتوی دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے ۔ آپ تو صرف اس وجہ سے برہم ہیں کہ مولٰنا عثمانی اور دیگر حضرات نے موجودہ حالات کے لحاظ سے فتوی دیا ہی کیوں یا یوں فرمائیے کہ فتوی نہ دینا چاہیے تھا ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

"کیا احتیاط کا مقتضا یہ نہ تھا کہ آپ مستفتی سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان لوگوں کے نام ظاہر کرے جن کی عبارتیں وہ پیش کر رہا ہے"۔

آپ اپنے مضمون میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ ۔

"آپ فرما سکتے ہیں کہ ہم مفتی ہیں قاضی نہیں ہیں ۔ بالکل درست"۔

اس کے بعد بھی آپ نا حقیقت آشنا ہو کر جو جی میں آیا لکھ گئے ہیں یہ حقیقت ہے کہ مفتی کی حیثیت ایک قاضی کی نہیں ہے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ جن الفاظ اور عبارات میں مفتی کے سامنے استفتا پیش کیا جائے ان کے لحاظ سے اور حدود کے اندر شریعت کا مسئلہ پیش کر دے ۔ ہاں اگر کوئی عبارت یا قول وغیرہ کسی کتاب کے حوالہ یا کسی شخص کے نام سے پیش کیا جائے اس وقت ضرور مفتی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ محولہ کتب وغیرہ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فتوی صادر کرے لیکن یہ تو کبھی بھی ممکن نہیں ہے کہ سرے سے فتوی ہی دینے سے انکار کر دے ۔

ف مفتیان کرام کے سامنے آئے دن نکاح ۔ طلاق حقوق زوجین ۔ وراثت وغیرہ کے استفتا پیش ہوتے رہتے ہیں کیا کوئی ایک مثال بھی آپ ایسی پیش فرما سکتے ہیں کہ مفتی نے نفس عبارت سے تجاوز کر کے نام و خاندان اور شجرہ دریافت کیا ہو یا نکاح کب ہوا اور کس نے پڑھایا ۔ یا نکاح کا رجسٹر طلب کیا ہو یا زوجین کی باہمی نا اتفاقی کے اسباب معلوم کیے ہوں یا ورثا کے اختلاف کے وجوہات نام یا متوفی کا نام وغیرہ دریافت کیا ہو ۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ تاریخ استفتا میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی نہیں دکھا سکتے کہ جس میں آپ کے خانہ ساز مقررہ اصول کے مدنظر کسی مفتی صاحب نے تفصیلات دریافت کی ہوں اور دار الافتا سے نکل کر مثل ایک قاضی یا مجسٹریٹ

کے دور دراز کے مقامی دریافت تحقیقات کے بعد فتوی صادر کیا ہو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس اصول کو مولنا عثمانی یا دیگر حضرات کے لیے آپ نے پیش فرمایا ہے اور مجبور بھی فرما رہے ہیں کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوں وہ کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے ہم تو یہی دیکھتے چلے آئے ہیں کہ استفتا اگر نام سے پیش ہوتا بھی ہے تو زید بکر عمرو کے نام سے اور انہی ناموں کی گردان کے ساتھ عبارت استفتاء پر فتوی دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سب مفتی جانتے ہیں کہ یہ نام قطعی فرضی ہیں اور حقیقی متعلقہ اشخاص میں سے کسی ایک کا نام بھی زید بکر عمرو نہیں ہے لیکن آجتک کبھی کسی نے اور خصوصاً آپ نے یہ سوال جو آج اٹھایا ہے نہیں اٹھایا۔ اگر آپ کے نزدیک یہ اصول صحیح نہیں تھا تو آج تک سینکڑوں اور ہزاروں مفتیوں کے متعلق اس گناہ عظیم کو آپ نے کیوں جائز رکھا اور کیوں آپ کے "ترجمان القرآن" کے صفحات اس گناہ کے زائل کرنے سے ابتک عاری رہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مفتیان کرام کے اس عام رویہ سے آپ ابتک بالکل لاعلم تھے اور اگر واقعی آپ کی لاعلمی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی تو آپ کو کیا حق ہے کہ اس قدر لاعلم ہو کر بھی رہنمائی اور رہبری کے علمبردار بنکر دنیا کو غلط فہمی اور نا اتفاقی میں مبتلا کریں۔

ف مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی یا دیگر حضرات نے اگر ایسی عبارت پر کہ جس پر نام بھی نہیں تھا فتوی دیا تو آپ مولنا پر یا مفتی پر اس قدر برانگیختہ ہو رہے ہیں حالانکہ آپ کو مستفتی کے ساتھ قوت آزمائی کرنی چاہیے تھی کہ اس نے بغیر نام کے فتوی حاصل کر کے بد دیانتی اور تحریف کے ساتھ کسی شخص واحد پر متعین کر کے کیوں فتوی شائع کر دیا لیکن تعجب ہے کہ آپ کے رسالہ کے صفحات اس سے یکسر خالی ہیں۔ مولنا پر تو آپ نے جرم عائد کرنے میں اپنے رسالہ کے پورے پانچ ورق سیاہ کر ڈالے لیکن مستفتی کے اس ناجائز اور گمراہ رویہ کے متعلق آپ کے قلم سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ فتوی دینے کے بعد یہ عبارت مولانا فراہی کی نکل آئی ورنہ ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہ تحریرات بزرگ مرحوم کی نہ ہوتی بلکہ کسی ایسے شخص کی ہوتی جو آپ کی نظر میں ملحد و زندیق ہوتا اور آپ خود بغیر نام کے پیش کر کے مولنا یا اور کسی مفتی سے فتوی طلب فرماتے اور یہ حضرات بھی آپکے اس اصول ۔

"کیا شریعت میں مفتی کو بالکل مستفتی کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مستفتی کے ہر سوال کا جواب ضرور ہی دے اور ان ہی

قیود کے اندر دے جن میں استفسار کیا گیا ہو۔"

پر عمل کرتے ہوئے فتویٰ دینے سے انکار کر دیتے تو ایمان اور ٹھنڈے دل سے سوچ کر فرمائیے کہ کیا آپ ہی پہلے آدمی نہ ہوتے کہ اس سے بہت زیادہ شد و مد کے ساتھ ایک مضمون زیب قرطاس فرماتے کہ یہ ہیں آجکل کے علماء اور مفتی جو محض شخصی وجاہتوں اور انسانی اقتدارات کے خوف سے اظہار حق کرنے سے ڈرتے ہیں اور فتویٰ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ آپ ہی کے الفاظ میں ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا شریعت میں مفتی کو آزاد کر دیا گیا ہے کہ مستفتی کا پابند نہ ہو بلکہ بلا لحاظ اس کے کہ اس سے کیا پوچھا اور دریافت کیا گیا ہے جو جی میں آئے لکھ مارے اور کیا مفتی کو اختیار دیا گیا ہے کہ امتحان کے اختیاری سوالات کی طرح جس سوال کا جواب چاہے دے اور جس کا چاہے نہ دے اور جن قیود کے اندر فتویٰ طلب کیا گیا ہے ان سے باہر ہو کر جو جی میں آئے اپنی طرف سے شاعری کر دے۔ فرمائیے مولانا اس سوال کے جواب میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا   کار طفلاں تمام خواہد شد

ف مذہبی نقطۂ نظر اور فن فتویٰ کے لحاظ سے تو آپ نے بھی مولانا کی احتیاط کا اقرار فرما کر شکریہ ادا فرمایا ہے کہ یہ ملحوظ بھی شکریہ کے قابل ہے" لیکن اس کے بعد بھی آپ مولانا پر فرد جرم لگائے بغیر نہ رہ سکے اور یہ تحریر فرما ہی دیا کہ " وہ اس تحریر کو لے گیا اور مستفتی نے قطعی کی حیثیت اختیار کر کے اس نے فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ خیالات و مقالات مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے متعین ہو گئے" ہم آپ ہی سے دریافت کرتے ہیں کہ اس میں مفتی کا کیا قصور ہے قصوروار تو مستفتی ہے۔ جس نے فتویٰ حاصل کیا اور بدنیتی کے ساتھ خلاف موقع و محل فتویٰ کو شائع کر کے اپنی کسی ذاتی اغراض کی بنا پر اس نے ناجائز فائدہ خود حاصل کیا اور دوسروں کو گمراہی میں مبتلا کیا، بالکل اسی طرح کہ جیسے اس زمانہ میں مختلف فرقوں کے لوگ قرآن مجید کی آیات کو توڑ مروڑ کر اور کھینچ تان کر غلط تاویلات کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے غلط ترجمانی و تفسیر کر کے گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس قدر صاف و صحیح زندہ مثالوں کو دیکھنے کے باوجود بھی آپ فرماتے ہیں کہ "یہ خنجر جو اس نے دو مرحوم مسلمانوں کی قبروں اور بہت سے زندہ مسلمانوں کے سینہ میں بھونکا کیا یہ جناب ہی کا عطا کردہ نہ تھا اور کیا آپ ہی نے اس کو اجازت عامہ عطا نہیں فرمائی تھی کہ جہاں چاہے آپ کی بتائی ہوئی شرط متعین کر کے اس کا اجرا بے تامل کر ڈالے" اگر آپ کے خیال میں یہ فتویٰ خنجر کی حیثیت رکھتا ہے تو ہم بھی تردید کرنا نہیں چاہتے مگر اس خنجر کا جو استعمال آپ نے ظاہر فرمایا اس سے ہم کو کلی

سمجھدار اور ذی ہوش انسان متفق نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے یہ خنجر اس لیے دیا تھا کہ عام مسلمانوں میں جو الحاد و زندقہ پھیلنے کا اندیشہ ہے اس کا استیصال کیا جائے اور عوام کے عقائد اور ذہنیتوں کی حفاظت کی جائے ٹھیک اس طرح جیسے کہ کوئی باپ اپنے جوان بیٹے کو ایک خنجر اس لیے دے کہ وہ اپنی حفاظت اور اپنے دشمنوں کی مدافعت میں کام لے لیکن وہ نادان و بزدل پوت اس خنجر سے اپنا ہی گلا کاٹ لے تو باپ بیچارے کا کیا قصور اور غلطی ہے؟ باپ غریب کی تو ہرگز غرض و غایت نہ تھی کہ وہ اس کا غلط استعمال کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے بالکل اسی طرح اگر مولانا نے از روئے شریعت فتویٰ دیا اور استفسار کے لحاظ سے صحیح دیا اور مستفتی نے اس سے نام وغیرہ کے اضافہ کے بعد ناجائز فائدہ اٹھایا اور غلط استعمال کیا تو بیچارے مفتی کا اس میں کیا قصور ہے اور آپ مفتی سے باز پرس کرنے والے یا پند و نصیحت فرمانے والے کون؟ آپ جو کچھ سزا و جزا بھی فرمانی ہے (اور بغیر فرد جرم لگائے آپ یہ ہی نہیں سکتے) تو مجرم حقیقی یعنی مستفتی پر فرمائیے نہ کہ مولانا پر اور خدا کی جب عدالت کا خوف مولانا جیسے با خدا انسان اپنے استاد جیسے خوف خدا رکھنے والی ہستی کو دلایا ہے پہلے اس سے خود خوف فرمائیے اور بعد میں مستفتی کو خوف دلائیے جس نے خنجر کا غلط استعمال کر کے خودکشی کے مرادف کام کیا ہے۔

ف ہمیں افسوس ہے کہ آپ اپنے زور قلم میں سنجیدگی سے بھی دور ہو گئے اور آپ نے اپنے مضمون کو اخلاق سے گری ہوئی عبارت اور سخت و درشت الفاظ کے استعمال سے بہت گندہ کر دیا ورنہ اگر آپ کے پنج ورقی مضمون کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ آپ کے خیال میں مولانا نے احتیاط نہیں کی حالانکہ مضمون کی ابتدا ہی میں آپ مولانا کی احتیاط کا شکریہ ادا کر چکے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جناب نے لفظ 'اگر' اور 'تو' کی بہت ہی قانونی قیود کے ساتھ فتویٰ تحریر فرمایا ہے یہ احتیاط بھی شکریہ کے قابل ہے" اور ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس شرط و جزا کے ساتھ فتویٰ لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینے کے معنی کیا ہیں"

نتیجہ اور معنی کیا ہوتے ہیں اس کو تو آپ ہی کا نکتہ رس اور زود فہم دماغ سمجھ سکتا ہے اس سے قبل تو نہ ائمہ کرام وغیرہ میں سے کسی نے شرط و جزا کے ساتھ فتویٰ دیا اور نہ کسی کو سمجھنے کی ضرورت پیدا ہوئی یہ سعادت تو آپ ہی کو حاصل ہوئی ہے کہ اپنے استاد کے ادب سے بھی بالا تر ہو کر شرط و جزا کے ساتھ فتویٰ دینے کے معنی سمجھا رہے ہیں

ف مولانا! اگر آپ کے خیال میں فتویٰ دینے میں ان حضرات نے فاش سیاسی غلطی کی تھی اور آپ کے لیے بھی ان حضرات کو پند و نصیحت کرنا تھا تو اس کا صحیح طریقہ یہ نہیں تھا جو آپ نے اختیار کیا ہے اور تشدد اور غیر سنجیدہ طرز بیان سے مخاطب کیا ہے بلکہ اگر درحقیقت آپ نے بافت حق کے لیے

بے چین اور انکی غلطیوں کی اصلاح کے لیے مضطرب تھے تو چاہیے تھا کہ حاضر خدمت ہو کر یا بذریعہ مراسلت افہام و تفہیم فرماتے اور شبہات کو حل کرتے اس کے بعد بھی اگر یہ حضرات انکی تسلی و تشفی کرنے سے قاصر رہتے یا انکار فرماتے تو آپ کو حق حاصل تھا کہ آپ ان تمام محترم و محتشم حضرات کی پگڑیاں سر بازار اچھال اچھال کر یہ راگ الاپتے کہ ”ان کی پوری عزت و حرمت ہمارے دل میں تھی اور ہے لیکن ہم کو اس ظلم کی مخالفت سے باز نہ رکھا۔“

سبحان اللہ اس ”پوری“ عزت کے قربان جائیے۔

ف۔ آپکے سیاسی اصول کے تحت مولنا کا یہ فتوی جس پر آپنے بے احتیاطی کا فتویٰ دیا ہے اگر مسلمانوں کے موجودہ ضعف اور انتشار میں افتراق اور فتنہ کا سبب بنتا ہے تو آپکا یہ مضمون بھی جو قطعی احتیاط سے معرا اور خالی ہے اگر اس فتوی سے زیادہ فتنہ اور انتشار کا سبب نہیں ہے تو اس سے کم بھی نہیں اور جس قصور کا مولنا کو قصوروار ٹھیرایا ہے اس سے زیادہ آپ مجرم قرار پاتے ہیں جناب کو معلوم ہے کہ آپکے دلخراش جملوں اور طعنہ آمیز الفاظ نے آپ ہی کے الفاظ میں کتنے زندہ مسلمانوں کے سینوں میں خنجر بھونک دیے ہیں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اتنی عظیم اور خطرناک بے احتیاطی برتنے کے بعد بھی آپ سمجھتے ہیں کہ آپکا دامن خون ناحق سے بالکل پاک ہے اور آپ صلاح و اصلاح کے علمبردار بنے ہوئے ہیں کاش کہ آپ اپنے اصلی گناہ کو سمجھکر تاویل و حجت کے بجائے توبہ و استغفار فرمائیں اور آئندہ اسکے اعادہ سے مجتنب رہیں

ف جناب نے مولنا عثمانی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے ممکن ہے کہ وہ بندوں کو خاموش کرنے کیلئے کافی تاویل و حجت ہوں مگر ہمیں خوف ہے کہ خدا کی عدالت میں تو یہ کام نہیں آسکیں گی اس لیئے ہم ایک تبصرہ احقاق حق کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مولنا اپنے گناہ کو سمجھکر تاویل و حجت کے بجائے توبہ و استغفار فرمائیں اور آئندہ اس کے اعادہ سے بھی مجتنب رہیں سبحان اللہ! پیر و مرشد آپ بجا فرماتے ہیں لیکن ہم کیسے مان لیں کہ بندے خاموش ہو سکتے ہیں جب آپ ہی خاموش نہ ہو سکے لیکن یہ ہماری غلطی ہے آپ ہنوز ایسے لاتر اللہ میاں کی عدالت کے وکیل بن کر بندوں کو ڈرا اور خاموش کر رہے ہیں اگر اس کا نام احقاق حق ہے تو فرمایئے کہ بدزبانی اور طعنہ و تشنیع کس چیز کا نام ہوگا ہمیں دیکھنا ہے کہ آپ اپنے گناہ کو سمجھکر کتنے عرصہ تک تو یہ استغفار میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری اس تنقید پر کس قدر تاویلات و حجتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

ف۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”مگر کیا مفتی اسلام پر تحقیق و تفتیش اور احوال زمانہ کے ملاحظہ اور مصالح امت کی رعایت کا قطعاً کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟“ از راہ کرم آپ ہی نے صراحت فرما دی ہوتی کہ کس موقع پر تحقیق و تفتیش اور کیسے فتاوی میں احوال زمانہ کو

ملاحظہ کرنا لازمی ہے اور کن مصالح امت کی رعایت کونسی صورتوں میں لازم ہو گئی ہے آپ نے جو فرائض مفتی کی طرف منسوب کئے ہیں انکا زیادہ حصہ قاضی یا مجسٹریٹ سے متعلق ہے۔

ف آپ فرماتے ہیں "شرط و جزا کے ساتھ فتوی دینے اور لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینے کے معنی کیا ہیں" جناب ہی صراحت فرمائیں تو احسان ہوگا کہ قرآن و حدیث کی رو سے شرط و جزا کا استعمال کہاں کہاں جائز ہے اور اکابر میں سے کیا کبھی کسی صاحب نے شرط و جزا کے ساتھ فتوی دیا ہی نہیں؟

ف آپ نے اپنی یاد دہی پر بس نہیں کی بلکہ مولانا شبیر احمد صاحب کو بزرگانہ اور عظمانہ (؟) دھمکی بھی دی کہ جائے حیرت ہے کہ اپنے فعل کے نتائج ظاہر ہو جانے پر بھی آپ شرمسار نہیں ہوتے تو بہ استغفار نہیں کرتے بلکہ الٹی شکایت فرماتے ہیں"۔ آپ کے عمل سے تو اس ارشاد کا اب تک ثبوت نہیں ملا اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کہاں تک اپنے الفاظ کی لاج رکھتے ہیں اور اپنی اس جرأت اور فعل پر جو آپ نے بزرگ ہستیوں کے مقابلہ میں فرمائی کس قدر شرمسار ہوتے ہیں کیا چشم بد دور یہی طریقہ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی تحریرات پر تبصرہ کرنے کا ہے۔

ف آپ نے آگے چل کر اپنے زعم علم اور استادانہ رنگ میں تحریر فرمایا ہے کہ "نہ ہم کو اس کا علم ہے اور نہ خداوند علیم و خبیر کو" آپ جیسے علماء کرام ہی کی زبان پر یہ جملہ کچھ زیب دیتا ہے کہ آپ نے بیک جنبش قلم اپنی لاعلمی کے ساتھ خدائے علیم و خبیر کو بھی شامل فرما لیا ہے معاذ اللہ ایسی جرأت تو کسی جاہل اور احمق کے لیے بھی زیبا نہیں جذبات کی رو میں ادب اور وہ بھی خدا کا اس طرح فراموش کر دینا کسی طرح بھی شایان شان نہ تھا مگر جب عقل اور دماغ پر جذبات غالب آجاتے ہیں تو پھر ادب کے حدود اور عدل و انصاف کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

ف آپ اگرچہ خود مدارس ہی کی بدولت اس مقام پر فائز ہوئے ہیں جہاں آپ ترجمان القرآن جیسے رسالہ کی رہنمائی فرما رہے ہیں مگر پھر بھی مدرسیت کا استیلاء آپ کو نہایت تنگ نظر معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے "علماء اسلام پر مدرسیت کا استیلاء کب تک رہیگا" بہت ممکن تھا اور ہے کہ ہم اس چیز کے استیلاء کو بھی ذہنی ابتلاء سمجھتے جس نے باوجود اسلامی دل و دماغ رکھنے کے پھر بھی آپ کو عام ذہن سے جانے پر مجبور کیا ہے لیکن ہم آپ کا اتباع کیوں کریں جبکہ ہم کو خود اس چیز پر اعتراض ہے۔

ف اب تک آپ کا تمام تر مشورہ یا نصیحت صرف احتیاط سیاسی کی حد تک تھی مگر اس سے بھی آپ مطمئن نہ ہو کر فرماتے ہیں "اس سے کوئی بحث نہیں کی جاتی کہ اس کی نیت کیا ہے" ہمیں تو آجکل کیا اس سے پہلے بھی کسی ایسے مفتی کا نشان نہیں ملتا جس نے عبارت یا قول کو چھوڑ کر نیت پر فتوی دیا ہو ممکن ہے کہ آپ کو علم ہو کیونکہ آپ کو علم کا بہت زعم ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ورنہ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ

مفتی تو الفاظ اقوال اور عبارت ہی پر فتویٰ دیتے ہیں اب اگر جناب نے نیت کی پیمائش کا کوئی ٹیپ (Tape) ایمان کے وزن کرنے کا کوئی اسکیل (Scale) ایجاد فرمایا ہے تو کیا کہنا دنیا کے سامنے اس حیرت انگیز مذہبی ایجاد کو پیش فرمائیے ہمیں امید ہے نوبل پرائز (Noble prize) آپکو یقیناً مل جائے گا افسوس آپکو یہ بھی علم نہیں کہ نیت کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا ہے بندوں کے لیے اس کا صحیح علم بہت مشکل ہے۔

ف اس تنقید کی روشنی میں براہ کرم اپنے مضمون کو پھر پڑھیے اور خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ آپنے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور آخر ان کا آپ کیا علاج کرسکتے ہیں اگر آپکا مقصد یہی کہ اکابر علماء سے ٹکراؤ اور جابجا مضمون لکھکر اپنے رسالہ کی توسیع اشاعت کریں تو ہم آپ کی طرف سے آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہیں۔ ف اب ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ مولانا نے جن عبارات پر جو فتویٰ اور شرعی مسئلہ پیش کیا ہے آپ اسے غلط ثابت کرسکتے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا ہے کیونکہ خود آپنے اصل فتویٰ سے بحث کرکے کوئی اصولی تردید پیش نہیں کی آپ ہی فرمائیں کہ مصلحت کی بنا پر حق گوئی سے باز رہنا صداقت ہے جیسا کہ آپکے مضمون سے محسوس ہوتا ہے یا حق گوئی کے لیے مصلحت کو نظر انداز کردینا حق ہے، کیا دلیل سمجھ کر آپنے آخر میں ذکر کیا ہے کہ ”اسلام کی محبت ہر محبت پر مقدم اور اسلام کی مصلحت ہر مصلحت سے زیادہ اہم ہے“ اور آپنے جو مصلحت کی آڑ پکڑ کر بے احتیاطی کا نام دے کر اینڈ کے پیچھے حق گوئی سے باز رکھنے کی کوشش فرمائی ہے کیا آپکے اس دعوے کی تردید آپ ہی کی مندرجہ بالا عبارت سے نہیں ہو جاتی ہمیں تو خوف ہے کہ کہیں آپکا تکیہ حضرت سعدی رح کے اس قول پر نہیں کہ ”دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز“ اگر ایسا ہے تو ہم افسوس کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نیتوں کے باب میں ایسی راستی فتنہ انگیز سے کہیں زیادہ جرأت حق کی ضرورت ہے۔

ف بے موقع نہ ہوگا کہ آخر میں مولانا کے اس خط پر بھی تبصرہ کردیا جائے جس کو آپنے بنائے فساد قرار دیکر ایک عام اضطراب اسلامی دنیا میں پیدا کردیا ہے مولانا فرماتے ہیں وہ میری عبارت پڑھ جائیے نہ کسی شخص کا نام ہے نہ مستفتی نے ہمکو جو استفتا دکھلایا تھا اس میں مولانا حمید الدین یا علامہ شبلی کا نام تھا میں نے لکھا ہے کہ اگر یہ خیالات و مقالات کسی شخص کے متعین ہو جائیں تو بیشک الحاد و زندقہ ہے اس سے احتراز واجب ہے“ فرمائیے اس میں مولانا نے کونسی بے احتیاطی یا شرعی غلطی کی ہے اس سے زیادہ صاف و صحیح اور دیانت دارانہ تحریر کونسی ہو سکتی ہے، آپ اپنی سخت تحریر اور مولانا کے اس نرم لہجہ اور صاف گوئی کا مقابلہ فرمائیے کہ یہ ہیں حضرات آپکی صاف سادہ تحریروں کو آپ الفاظی جال میں الجھا کر غلط رہبری کرنا چاہتے ہیں مخدوم من یہ زمانہ ترقی اور زرا فراخ دلی کے لیے یہ ضروری ہے کہ نہ اپنے بالا ہمعصروں پر بیجا اعتراضات کئے اور انکے خلاف غلط پراگندہ کرکے دنیا سے متعارف ہو بلکہ اس کا بڑی حد تک ذاتی خصوصیات اور اہلیت پر انحصار ہے۔

ف اس کے بعد مولانا اپنے اس خط میں تحریر فرماتے ہیں "وہ آسان بات بھی کہ ثابت کر دیا جاتا کہ فلاں فلاں حضرات کے یہ عقائد نہیں جیسے چھپی ہوئی
کم از کم مجھے اس سے کچھ تعرض نہ ہوتا بلکہ خوشی ہوتی" اس سے زیادہ سچائی اور صداقت کیا ہو سکتی ہے، آپ اپنی تحریروں کی ایک ایک عبارت بلکہ جملہ بھی اس وزن اور قیمت کی
دکھلاتے ہیں اور سمجھتے اس سے زیادہ کیا رواداری ہو سکتی ہے کہ تحریر یا وہ خواہ بھی اگر عقائد نہیں ہیں تو مولانا اس کو قابل تعرض نہیں خیال فرماتے لیکن آپ کی
خواہ مخواہ الفاظ کی صورت و ماہیت اور معانی بدل کر دنیا کی غلط رہبری کرنے پر مصر ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس سے بھی زیادہ آسان بات یہ تھی کہ جناب
تحقیق کیے بغیر فتوی لکھنے سے انکار فرما دیتے" سبحان اللہ کیا منطق ہے اس کے متعلق ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ جب نام وغیرہ کے فتوی طلب کیا جائے
تو تحقیقات کی ضرورت مفتی کے لیے نہیں ہے اور فتوے سے انکار بھی مفتی کا کام نہیں ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک استاد کے سامنے عبارت رکھ کر معانی
دریافت کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کتاب کا اور مصنف کا نام بھی بتلایا جائے استاد کو دریافت کی ضرورت نہیں استاد کا کام ہے کہ نفس عبارت کا مطلب شاگرد کو سمجھا دے

ف مولانا حمید الدین صاحب فراہی مرحوم کے متعلق مولانا تحریر فرماتے ہیں "مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں میں نے نہیں دیکھیں ایک دفعہ سرسری ملاقات ہوئی ہے زیادہ
احوال معلوم نہیں ہو سکے آپ نے جو کچھ ان کی عبادت و زہد کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں نہ مزید شہادت کی ضرورت ہے میں کم از کم
آپ کو اپنے سے زیادہ ثقہ سمجھتا ہوں" مولانا فرمائیے آپ نے جو نیت کا اکمل ایجاد فرمایا ہے اس سے اس تحریر کا کیا نتیجہ نکلتا ہے کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے
مولانا نے مولانا فراہی کی ذات یا شخصیت کو نظر انداز کر کے عمداً ان کو بدنام و رسوا کرنے کی کوشش کی ہے یا یہ صرف آپ ہی کی حدت طبع ہے افسوس ہے
کیسے حسن نیت یا تاویل کی طرف آپ نے مولانا کی رہبری فرمائی ہے خود آپ نے اس سے کام نہیں لیا اور عمداً احتراز کیا ہے۔

ف مولانا اپنے خط میں اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ مولانا حمید الدین فراہی
کی جن دو عبارتوں پر مفتیان عظام نے تکفیر کی بنا کی تھی میں غور و تامل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سوء تعبیر یا مسامحت عنوان سے ان کی یہ عبارت خالی نہیں
لیکن موجب تکفیر نہیں ہو سکتی" سچائی اور صداقت اسی کا نام ہے کہ جب کہ فتوی عبارت محض پر طلب کیا گیا الفاظ پر حکم شرعی لگا دیا گیا اور
جب نام سامنے آیا اور شخصی اعمال کے تمام احوال بھی سامنے لائے گئے تو پوری پوری احتیاط کے ساتھ اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور اپنی بات کی
پچ نہیں کی جاتی ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ بڑے بڑے ائمہ نے تحقیق کے بعد کسی چیز سے رجوع کر لیا ہے لیکن اس اولو العزمی و دیانت اور امانت کے
بعد بھی آپ ہیں کہ پیچھے پڑے ہیں اور اپنی غلط تاویلات میں دوسروں کو شریک کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں اب تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بعد بھی اگر آپ نہ
سمجھیں تو دنیا میں کوئی شخص آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

نیاز مند۔ محمد یحییٰ رضوی (از ورنگل)